تفصیلی مطالعے

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ......ایک مطالعہ

صفحہ نمبر ۲۳

ڈاکٹر محمد امین.........ایک مطالعہ

صفحہ نمبر ۶۱

ڈاکٹر حنیف ترین........ایک مطالعہ

صفحہ نمبر ۳۸۲

تفصیلی مطالعہ

مرزا حامد بیگ

مرزا حامد بیگ

مرزا حامد بیگ افسانہ نگار بھی ہیں اور افسانے کے ارتقائی مراحل پر ان کی نظر بھی ہے۔ افسانوی ادب کے بارے میں ان کی تنقیدی آرا سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے رویہ کی سنجیدگی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ کچھ یہی صورت ان کے اپنے افسانوں کی ہے۔ انھیں اس بات کا خود اعتراف ہے کہ وہ فرانس کے زوال پرست ادیبوں سے بہت متاثر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں احساس تنہائی، کرب، بے گانگی اور معاشرہ سے بے زاری کے جذبات خاصے ابھر کر سامنے آتے ہیں تاہم ان کا اسلوب نگارش ہماری توجہ اپنی طرف مبذول ضرور کراتا ہے۔ اس شمارے میں ان کے جو افسانے شامل کیے جارہے ہیں وہ ہماری اس رائے کو بڑی حد تک ثابت کرسکتے ہیں۔ مثلاً ان کے افسانہ "سانڈنی سوار" میں انھوں نے مذہبی علما کی ظاہر پرستی کو بڑے سلیقے سے اجاگر کیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مذہب کے ظاہر ہی کو سب کچھ سمجھنے والے تنگ نظری اور ریاکاری کا شکار ہوتے ہیں جب کہ مذہب کی روح اور مذہبی تعلیمات کے جوہر کو اپنے لہو میں رچانے والے اصلی انسانیت کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح کالی زبان میں انھوں نے مکافات عمل کا نقشا ابھارا ہے لیکن ان میں افسانوں میں ان کا رویہ غیر سائنسی ہونے کے باوجود اپنے اسلوب کی کشش سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے۔

راغب شکیب

قلمی معاونین اور کرم فرماؤں سے گزارش

"ارتکاز" صرف ان قلمی معاونین کو ارسال کیا جاتا ہے جن کی نثری تخلیقات "ارتکاز" کی زینت بنتی ہیں۔

- "ارتکاز" میں اشاعت کے لیے اپنی تحریریں (جملہ مضامین، افسانے، غزل، نظم وغیرہ) کاغذ کے ایک طرف خوشخط لکھی ہوئیں۔

مدیر سہ ماہی "ارتکاز" ایف ۳ / ۸۳ مارٹن کوارٹرز جہانگیر روڈ۔ کراچی ۷۴۸۰۰ کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

- طبع زاد اور غیر مطبوعہ تحریر کا اصل مسودہ بھیجتے وقت اس کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیے فوٹو کاپی قابل قبول نہ ہوگی۔
- اپنی تحریروں کے حوالے وغیرہ کی انگریزی عبارت بڑے حروف میں لکھیئے۔ بہتر ہے ٹائپ کروا کر ارسال فرمائیں۔

تحریروں کے ساتھ مصنفین اپنی تصویر کی بجائے اسکیچز ارسال کریں۔

"ارتکاز" کا زر تعاون کسی ذاتی نام کی بجائے صرف "ارتکاز" کے نام بھیجا جائے۔

غیر ممالک میں مقیم "ارتکاز" کے کرم فرما مقررہ زر سالانہ کی رقم جو پونڈ، ڈالر، ریال، وغیرہ میں "ارتکاز" کے ہر شمارہ میں درج ہوتی ہے اس رقم کو پاکستانی کرنسی میں تبدیل کرا کے ارسال فرمائیں۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ
گورنمنٹ کالج ۔ اٹک

داخلی مونولاگ

سوچتا ہوں اس زندگی کے پھیلاؤ سے پہلے کا زمانہ کتنا خوب صورت تھا ۔ اپنی ذات کی لامحدود ، حدود میں آوارہ خرامی اور اندرون سندھ کے قدرے غیر آباد علاقے۔

ضلع دادو (سندھ) تھرڑی محبّت ایک چھوٹا سا قصبہ تھا ، جس میں میرے شعور نے آنکھ کھولی ۔ ہمارے گھر کے قریب بہنے والی گدلے پانی کی نہر کے دونوں اطراف میں دور تک نکل جاتا شاداب علاقہ تھا۔ آموں کے باغات تھے ، باغوں کے رکھوالوں کے ہاتوں میں گھومنے والی غلیلیں تھیں اور ہریل توتوں کے جھنڈ کے جھنڈ ۔

نیا بالہ میں بیتی ہوئی شامیں یاد کرتا ہوں ۔ جب ہر دوسرے تیسرے ڈاکا آتا تھا۔ ڈاکو شجاع بھنبھرو اور اس کے ساتھی گاؤں کے گاؤں لوٹ لے جاتے تھے۔

یہ میرا بچپن اور لڑکپن ہے۔

لیکن ذرا ٹھہریے ، ایک میرا آبائی علاقہ بھی ہے۔ کیمبل پور میں علاقہ چھچھ کا ایک چھوٹا سا گاؤں " کمالہ " اور اس کی مغل حویلی اور آبادی کے چاروں اطراف میں میلوں تک پھیلے اجاڑ میدان ۔ مغلوں کی جاگیریں ، جو کبھی آباد رہی ہوں گی۔

یہی وہ منظر نامہ ہے جو میرے افسانوں میں جاگتا ہے اور اس سے جڑا ہوا مغل اجتماعی لاشعور کروٹ لیتا ہے۔

میں بیک وقت ماضی اور حال میں جیتا ہوں۔

میں نے اپنا پہلا افسانہ بالہ ، سندھ (۱۹۶۱ء) میں لکھا تھا۔ قبلہ والد صاحب نے اسے سن کر کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ خود انگریزی میں لکھتے تھے اور " سینٹینل " میں چھپتے تھے۔ میں اس وقت چھٹی ساتویں کا طالب العلم رہا ہوں گا۔ وہ افسانہ سنا کر میں نے

چاہا تھا کہ وہ داد دیں، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے بعد میں لکھتا تھا اور پھاڑ دیتا تھا۔ کسی کو دکھانے اور سنانے کی خواہش نے دم توڑ دیا تھا۔ شاید یہ میری انا تھی جو مجھے برباد کر رہی تھی (اب بھی اس کا سلوک ویسا ہی ہے) لیکن اب شاید میں اپنی انا سے کام لینا بھول گیا ہوں۔ اپنی تحریروں میں اور عام زندگی میں بھی۔

استاد محترم سجّاد باقر رضوی صاحب نے اچھا ہی کیا کہ میری انا کو یا یوں کہنا چاہیے کہ مغلیہ تلوار کو کند کر دیا۔ اب میرے شملے کا طُرّہ خم کھایا ہوا ہے۔ ترکش کے سارے تیر میں نے آسمان کی سمت اچھال دیے ہیں۔ شاید ایک زمانہ آئے گا، جب میرے اچھالے ہوئے تیر زمین کی طرف پلٹیں گے۔ تب میں، کھلے میدانوں میں، گلیوں اور بازاروں میں، منافقوں کے اجاڑ دلوں میں اور محبت کی سرزمین پر واویلا کرتے ہوئے ان تیروں کو اپنے سینے میں سمیٹنے کا جتن کروں گا۔ مبادا کسی کا دل دکھے۔

اب تک میرے نزدیک جینے کی صرف دو صورتیں رہی ہیں۔

ہار کر بیٹھ رہو یا دوسروں کے گھٹنوں پر بجتے ہوئے طوق کی آواز سنو۔ میں لکھتا ہوں لیکن اندر ہی اندر اپنی بے بسی پر روتا ہوں۔ مجھ سے تو اخبار کا خوش نویس ہی اچھا، جس سے جو بن پڑتا ہے اس کا اظہار تو کرتا ہے۔ وہ یہی کر سکتا ہے نا کہ اہم خبر لکھتے وقت اپنے قلم کی کاٹ کو خبر کے چوکھٹے میں بھر دے۔ تاآنکہ وہ خبر ہر پڑھنے والے کے دل میں ترازو ہو جائے۔ کاتب یہ کام تو کرتا ہے۔ مجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا۔

اس لیے کہ میں ایسے ادب پر سو جان سے فدا ہوں، جو ضخیم ادبی جرائد اور میری مطبوعہ کتب کی جلدوں میں قید تنہائی کاٹتا ہے۔

شاید میں نے اپنا قاری چنتے وقت غلطی کی ہے۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ میں نے ان گنے چنے افراد کو اپنا قاری بنایا، جن کے لب اور قلم سے کبھی کسی نے توصیف کا کلمہ نہ سنا، نہ پڑھا۔

دوسری طرف میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو عامیوں سے رابطہ رکھتے ہیں مجھے تسلیم کہ میں نے ایسا کچھ جان بوجھ کر کیا۔ ذرا فاصلے سے عامیوں کے ذوق کی تربیت کرنا چاہی یا کم از کم میں نے ایسا سوچا۔

اردو افسانے کا پیش منظر بہت دھندلا ہے اور مجھے شدید غیر یقینی صورت حالات کا سامنا ہے۔ لیکن یہ بھی میری مجبوری ہے کہ میں فرانسیسی زوال پسندوں کے تخلیق کردہ ادب سے متاثر ہوں۔ میں موجودہ تہذیبی نظام سے مطمئن نہیں۔ اس لیے بھی کہ میں آدمی کو من و عن قبول کرتا ہوں، چھلنیوں میں چھان کر نہیں۔

میں ایک ایسا جلا وطن ہوں جو اپنے ارد گرد کے وسیع تناظر میں پھیلے ہوئے اجنبی، خارجی ماحول سے اپنی ذہنی شناخت نہیں کروا پاتا۔ میں منافق نہیں۔ اپنے گرد و پیش سے فرار کا راستا نہیں اپناتا۔

یہ کج من بیان فقیر بڑے بڑے ادبا، کو لفظ کا نامعقول استعمال کرتے دیکھتا ہے۔ وہ جب اکہرے مطالب نکالتے ہیں تو مجھے غیر متحرّک پانی کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔

ایسے میں میرے لیے صرف یہی کچھ باقی رہ گیا ہے کہ اپنی اذیّت رقم کروں۔ اپنی تنہایاں لکھوں۔ اب اگر یہ سب دیکھ کر کوئی کہے کہ مرزا حامد بیگ تنہا پسندی کے جذبے میں پناہ لیے ہوئے ہے تو مجھے دکھ ہوگا۔ اس لیے کہ میں تو زندگی کے اس ناقابل برداشت حصار میں جینا چاہتا ہوں۔

خواجہ حسن بصری کا کہنا ہے کہ:

"ہزار دوستیاں بھی ایک عداوت کے بدلے میں نہ خریدو"

کیا میرا عمل اس کے الٹ دکھائی دیتا ہے؟ میں ہزار عداوتیں خریدتا ہوں، ایک سچّی دوستی کے عوض۔

میں اپنے قاری کے لیے یقیناً ناقابل برداشت ہو جاتا ہوں، جب اپنی ذات کے سنّاٹے پر سفر کرتا ہوں۔ میری ذات کا سناٹا میرے قاری کی ذات میں گونجنے لگتا ہے اور وہ اس گونج کو برداشت نہیں کر پاتا۔ انسانی ذات کا تاریک برّاعظم ایک ہی ہے۔ کیوں نہ ہم ایک دوسرے کو اور خود اپنی ذات کی ساری ٹیڑھ اور برائیوں سمیت کھلے دل کے ساتھ قبول کرلیں۔

میں علامتی اظہار کو احساسات اور جذبات کا کھرا اظہار مانتا ہوں۔ اس لیے کہ علامت، خیال کی سب سے بڑھ کر آپ روپی صورت ہے۔ اور یہ تو سب مانتے ہیں کہ لفظ

سچائی ہے اور طیب لفظ کی اہمیت سچی حقیقت سے دوچار ہونا ہے۔ یوں میرے نزدیک لفظ کو اس کے مروّج اور متعیّن معنی میں استعمال کرنا سب سے بڑھ کر احمقانہ فعل ہے۔

یہ تسلیم کہ ہم سب اس فعلِ قبیح سے گزرتے ہیں۔ اپنی ضروریات کے تحت لفظ کو اظہارِ محض یا ابلاغ محض کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہم تخلیقی عمل کے دوران بھی اس گھٹیا رسم کی ادائیگی میں مصروف رہیں؟

تخلیق کار کے تخلیقی لمحات اس کی اپنی ملکیت ہوتے ہیں۔ میں "نقالوں کی رات"، "بابے نور محمدے کا آخری کبت"، "انتظار گاہ" اور "سانڈنی سوار" اپنی اس نجی ملکیت سے باہر رہ کر نہیں لکھ سکتا۔ پھر میں کیوں کسی اور کو اپنے تخلیقی لمحات میں حصّہ دار بناؤں؟

بڑی شاعری اور بڑی نثر کی خوبیاں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ بلکہ معقول نثر تو بڑی شاعری کی طرح غنائیت کی تمنا بھی کرتی ہے۔ میرا افسانہ بھی ایسی ہی نثر کی آرزو کرتا ہے جو خطابت کی گردن مروڑ سکے۔

میں نے احساساتی سطح پر علامات کا ایک نظام وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک ایسا نظام جس کا منطقی پیرا فریز ممکن نہ ہو۔ میں سراسر ترسیل معنی کی کوشش نہیں کرتا۔ ہماری بول چال کی زبان، لغت کی پابند ہے۔ یہ زبان ایسے الفاظ سے تشکیل پاتی ہے جو برائے نام زندہ ہیں۔ ان میں زندگی کی بہت کم رمق باقی رہ گئی ہے۔ انہی لفظوں کو دوبارہ زندگی بخشنے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں نئے ڈھنگ سے برتا جائے، انھیں میلے برتنوں کی طرح مانجھ کر اجالا جائے۔ یوں ابہام پیدا ہوگا، لیکن قاری کے بھی تو کچھ فرائض ہیں۔ میں خواہش کرتا ہوں کہ میرا قاری بھی پُرانے بندھے ٹکے فارمولوں سے باہر نکلے۔ باہر نکلے گا تو لفظ بھی اپنے متعیّن معنی کی حدود سے باہر آجائے گا۔

ادب عالیہ پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ بڑے تخلیق کاروں نے ہر دور میں لفظ کو آکسیجن مہیا کی۔ میر محمد تقی میرؔ اور مرزا رفیع سوداؔ ہی کو لے لیجیے۔ انھوں نے "آہ" کو نئے معنی دے دیے۔ مجھے تو عسکریؔ صاحب کی معرفت تصوّف کے تھوڑے بہت مطالعہ نے یہی بتایا کہ درد کی انتہاؤں پر "آہ" اور "واہ" کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ذرا سوچیے تو حضرت ایوبؑ انتہائی اذیت کے لمحات میں زبان پر کیا لاتے ہوں گے؟ جب کہ انھیں معلوم

تھا کہ یہ اذیتیں تو ان کے صبر کا امتحان ہیں۔ کیا وہ صرف "آہ" کہتے ہوں گے؟ میرے خیال میں تو ان کی زبان پر "واہ" آتا ہوگا۔

سو میں بھی اپنے قاری اور ناقد کے لطف و کرم پر "آہ" اور "واہ" کا فرق بھول گیا ہوں۔ اپنی ہر واردات کو رقم کرتا چلا جا رہا ہوں اور بس۔
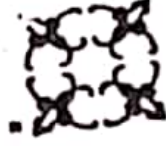
مٹی کا زنگ

یہ سب جیسے اچانک ہی ہوا۔ ریلوے اسٹیشن پر معمول کی زندگی نے یک لخت کروٹ لی اور بھرستے ہوئے چہروں اور نیند سے بوجھل آنکھوں والے مسافروں کا ایک ہجوم اکٹھا ہوتا چلا گیا۔

رات کا پہلا پہر ہو گا، جب یہ واقعہ پیش آیا۔

دور کے سفر پر نکلنے والے مسافروں اور اسٹیشن کے عملے کے لیے یوں تو یہ کوئی انہونی بات نہ تھی لیکن پھر بھی ایسا بہت کم ہوا ہے کہ یوں اچانک ہنستا بولتا ہوا کوئی شخص یک لخت چپ ہو جائے اور پتا چلے کہ مر گیا۔

لدے پھندے ٹھیلوں کو دھکیلنے والے قلی، پان بیڑی سگرٹ اور نان پکوڑے بیچنے والے چھوکرے، ٹی اسٹال کے کارندے، ڈاک بابو، ٹکٹ کلکٹر اور شام کا اخبار بیچنے والے لڑکے، سب حیران رہ گئے۔

لوگوں کا ایک ہجوم تھا، جس کے بیچ یوں اچانک دم دے جانے والا ادھیڑ عمر کا مسافر لوہے کے ایک خالی بنچ پر سر نیوڑھائے بڑے پُرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔ جیسے زندہ ہو اور کسی گہری سوچ میں ہو۔

"یہ آیا کہاں سے؟"

"آیا نہیں --- شاید جا رہا تھا"

"کہاں جا رہا تھا؟"

"خدا جانے۔"

"جیب میں دیکھ لیتے۔ شاید کوئی کاغذ کا پرزہ ------"

"نہیں۔ سب دیکھ لیا۔"

بھانت بھانت کی آوازیں تھیں اور طرح طرح کے سوالات۔

"اس کا سامان بھی تو ہو گا ساتھ۔"

"کوئی لے اڑا شاید۔"

اس کے برابر میں بھی تو کوئی بیٹھا ہی ہوگا۔ کسی نے دیکھا نہیں ۔ کیسے ہوا یہ سب ؟ سفید بھووں والے ایک بزرگ نے پوچھا ۔ جواب میں سب چپ تھے ۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

" وضع قطع سے تو مقامی آدمی دکھائی دیتا ہے ۔ "

" ہاں -- شاید ۔ "

" واچ اینڈ وارڈ کو اطلاع کرو بھائی ۔ " ایک نے مشورہ دیا۔

" آئے تھے دو وردیوں والے ۔ دیکھ داکھ کر چلے گئے ۔ "

" چلے گئے ----۔ وہ کیوں ؟ "

" وہ کہہ رہے تھے ، یہ ہمارے تھانے کی حدود کا معاملہ نہیں ہے۔ کہیں دور سے لایا گیا ہے ٹرین پر ، اور یہاں لاکر اس بینچ پر بٹھا گئے ۔ "

" نا بھئی ، ایسا کچھ ممکن نہیں ۔ "

" یہاں کیا ممکن نہیں ہے صاحب ۔ ہو سکتا ہے آدھ گھنٹہ پہلے کراچی کی طرف نکل جانے والی اٹھارہ ڈاؤن خیبر ایکسپریس پر اسے لائے ہوں اور یہاں بٹھا گئے ہوں ۔ "

" ارے نہیں بھئی --- گزشتہ ایک گھنٹے سے تو ہم لوگ دیکھ رہے ہیں اسے ۔ ہم سے پہلے پولیس والے پڑتال کر گئے ۔ شاید اس سے بھی پچھلی گاڑی پر لایا گیا ہو ۔ "

" لیکن یہ کوئی بات تو نہ ہوئی نا ۔ وہ آئے بھی اور دیکھ کر نکل لیے ۔ ان کا کام تھا تفتیش کرتے ۔ "

" تفتیش کرتے ---- واہ ---- کیس ہو کسی اور علاقے کا اور یہ بلا وجہ ہلکان ہوتے پھریں ۔ کہاں پتا کرتے پھریں دوسروں کی حدود میں ؟ "

" آپ بہت حمایت کر رہے ہیں پولیس والوں کی ۔ "

" اچھا بھئی ۔ نہیں کرتا حمایت ۔ یہ ڈاک گھر کے پچھواڑے ، واچ اینڈ وارڈ کا کمرہ ہے جائیے بلا لائیے انھیں ۔ اگر آپ کے کہے پر آتے ہیں تو --- "

" ارے نہ آئیں ، نہیں آتے تو --- حق بات تو کرنی چاہیے نا ---- "

" حق بات -- ٹھیک کہا آپ نے ۔ آپ دیں گے گواہی ، اس بات کی کہ مرنے والے کو آپ نے اس بینچ پر بیٹھے دیکھا ؟ "

" میں کیوں دوں گا گواہی ؟ خواہ مخواہ--- سب دیکھ رہے ہیں --- ہم اتنے سارے لوگ ۔"

" اچھا --- ٹھیک ہے۔ چلیں میرے ساتھ کون کون چلے گا۔ بلا کر لاتے ہیں دوبارہ انھیں ۔ لیکن اپنی بات پر قائم رہیے گا۔"

وہ بھنایا ہوا نوجوان مجمع کو چیرتا ہوا چلا۔

" آئیے ---- آئیں میرے ساتھ ---- آتے کیوں نہیں ؟"

اس نے ہجوم کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا نکل گیا۔ اب ہجوم بکھرنے لگا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وردی والے آہی نہ جائیں ۔ کوئی پانی کی صراحی بھرنے نل کی طرف ہو لیا۔ کسی نے اپنے بچے کو انگلی سے لگایا اور اپنے سامان کے گرد منڈلانے لگا۔ کسی کو نان پکوڑے بندھوانے تھے، وہ ادھر نکل لیا ۔ غرضیکہ سب کو کوئی نہ کوئی کام یاد آگیا۔

سب دور سے کنڑے کن اکھیوں سے دیکھ رہے تھے اسے، اور وہ لوہے کی خالی بنچ پر سر نیوڑھائے ، بڑے پرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔ جیسے زندہ ہو ، اور کسی گہری سوچ میں ہو۔ اس اثنا میں ایک پسنجر گاڑی آکر رکی اور کافی دیر ٹھہری رہی۔

" چائے والا ---چائے ۔"

" پان ، بیڑی ، سگرٹ ۔"

" اے چائے والے ۔"

" ٹھنڈی بوتل"

" قلی ---- ارے ادھر --- قلی -----"

گاڑی کیا آئی ، ریلوے اسٹیشن کی چہل پہل بحال ہوگئی ۔ پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے ایک مسافر نے وقت گزاری کی خاطر جیسے بات چلائی:

" ارے بھئی کے گھنٹے لیٹ ہے ، آپ کی پسینجر؟ اسے تو خیبر میل سے پہلے پہنچنا تھا نا؟"

" کیا پوچھتے ہیں صاحب ۔ کچھ تو پہلے سے لیٹ تھے اور کچھ خیبر نے لیٹ کروا دیا ۔ بائی پاس پر رکے رہے ، اس کے انتظار میں ۔ وہ گزر گئی تو چلی ہے اپنی گاڑی ---- " ایک اکتائے ہوئے مسافر نے کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

" کوئی پوچھنے والا نہیں صاحب ۔"

"ہاں جی ۔ بس اللہ کے آسرے پر چلے جاتے ہیں ۔"
غضب خدا کا ۔۔۔ وہ دیکھ رہے ہیں نا آپ ۔۔۔۔ وہ سامنے بینچ پر ۔۔۔۔ وہ جو سر نیوڑھائے بیٹھا ہے نا بھلا مانس ۔۔۔۔۔۔ وہ زندہ نہیں ، مر چکا ہے ۔"
"ہیں ؟ وہ کیسے ؟"
"خود دیکھ لیجیے ، گاڑی سے اتر کر ۔"
"کیوں جی ۔۔۔۔ کیا واقعی وہ مر گیا ؟"
رکی ہوئی پسینجر ٹرین کے مسافروں نے ہڑ بڑا کر حیرت کے ساتھ کھڑکیوں میں سے باہر جھانکا اور دروازے کا رخ کیا۔
ایک بار پھر جمگھٹا سا لگ گیا اس کے گرداگرد ۔
"کہاں جا رہا تھا ؟"
"جا نہیں رہا تھا ، بلکہ لایا گیا ہے ، اسی حالت میں ۔"
"اسی حالت میں ؟ یعنی مر چکا تھا اور یہاں اتار گئے ؟؟"
"جی ہاں ۔ سنا تو یہی ہے ۔"
"کوئی پولیس کو اطلاع کرو بھائی ۔"
"آئے تھے ۔ پڑتال کر گئے ہیں ۔ پھر پلٹ کر نہیں آئے ۔"
"کوئی اور جاؤ ، ان کے پیچھے ۔۔۔۔ مٹی ٹھکانے لگ جائے ۔"
"گئے تھے ایک صاحب ۔ لوٹ کر نہیں آئے ۔"
"دھر لیا ہوگا ، بے چارے کو ناحق ۔"
"جان چھڑانی مشکل ہو گئی ہوگی ۔"
"ایسے میں کون دیتا ہے گواہی"
اب گاڑی نے وسل دیدی تھی اور گارڈ انجن کے رخ پر سبز روشنی دکھاتا ہوا اپنے ڈبے کی طرف چل پڑا تھا۔
"گواہی کی کیا بات ہے صاحب ۔۔۔ ہم دے دیتے ۔ ایک انسان کا معاملہ ہے ۔"
"لیکن ہم نے تو آگے جانا ہے ۔ جا رہے ہیں بچوں کے ساتھ ۔"
اب گاڑی نے رینگنا شروع کر دیا تھا ۔

"لو، اپنی گاڑی تو چل دی --- کچھ کیجیے گا صاحب۔"

"ارے مل کر چلے جاؤ نا سب کے سب۔ ثواب کا کام ہے۔"

یہ سب آوازیں چلتی ہوئی گاڑی کی کھڑکیوں اور دروازوں میں سے آرہی تھیں اور بچے کچھے لوگوں کا ہجوم، اس لوہے کی بھاری بینچ کے گرد خاموش کھڑا تھا۔

گاڑی چلی گئی تو ایک کرنجی آنکھوں والے منحنی سے شخص نے بات چلائی:

"اس کا سامان بھی تو ہوگا ساتھ۔ کچھ دیکھ داکھ کر معلوم کر لیتے کہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔"

"شاید کوئی لے اڑا سامان۔"

"ہے ہے، کیا زمانہ آگیا صاحب۔ مردوں کو بھی نہیں بخشتے۔"

"جیب سے کچھ نکلا؟"

"آئے تھے دو وردی والے۔ پڑتال کر گئے۔ شاید کچھ پتا ٹھکانہ نکلا ہی ہو۔ لیکن وے کہہ رہے تھے، یہ کیس ہماری حدود کا ہے نہیں۔"

"حدود کیسی؟"

"حد ہوتی ہے نا اپنے اپنے تھانے کی۔ پرائے لفڑے میں کون پڑتا ہے۔"

"پرایا لفڑا؟ وہ کیسے؟ کام ہے ان کا۔"

"ہوگا صاحب۔ مجھ پر کیوں خفا ہوتے ہیں آپ؟"

"عجیب بات کرتے ہیں آپ بھی۔ ہوگا کیا، کام ہے ان کا۔"

"مجھے معاف رکھیے صاحب۔ غلطی ہوگئی کہ آپ نے پوچھا اور میں نے جواب دے دیا۔"

"اجی چھوڑیے۔ میں دیکھتا ہوں۔ لاتا ہوں ابھی انھیں اپنے ساتھ۔"

کرنجی آنکھوں والا منحنی شخص چل دیا ایک طرف۔ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے۔

"جلدی واپس آجایے گا۔" کسی نوجوان نے چوٹ کی۔

"آرہا ہوں، اور دیکھ لیتا ہوں تمھیں بھی۔"

"ارے خاک آئیں گے آپ۔ بہت سے گئے یہ کہہ کر اور بھاگ لیے۔" نوجوان آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

ہجوم ، ایک بار پھر بکھرنے لگا تھا ۔ مبادا وہ لوٹ آئے اپنے ساتھ واچ اینڈ وارڈ والوں کو لیے ہوئے ۔

اب اکا دکا افراد دور سے کھڑے ، چور نظروں سے دیکھ رہے تھے اسے ، اور وہ ، لوہے کی خالی بینچ پر سر نیوڑھائے بڑے پرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔ جیسے زندہ ہو ۔

رات کا دوسرا پہر ہو گا، جب پہلے تو شنٹنگ کرتا ہوا ایک انجن گزرا اور اس کے بعد بیس ڈاؤن چناب ایکسپریس کی متوقع آمد سے متعلق گھنٹی ہوئی۔ چناب نے دوسرے پلیٹ فارم پر رکنا تھا ، اس لیے دیکھتے ہی دیکھتے ادھر کی رونق برابر والے پلیٹ فارم پر منتقل ہو گئی۔ دونوں پلیٹ فارموں کے درمیان گہرائی میں پٹریاں بچھی ہوئی تھیں اور لوہے کا اونچا جنگلا سر اٹھائے کھڑا تھا۔

پان ، بیڑی ، سگرٹ بیچنے والے چھوکرے رابطہ پل پر سے ہوتے ہوئے ، اب اپنی چھابڑیوں کے ساتھ ادھر چلے گئے تھے ۔ چائے ، نان پکوڑے اور ٹھنڈی بوتل کی آوازیں بھی ادھر ہی سے آرہی تھیں ۔ پھر درمیان کی پٹری پر چناب آگئی اور اس طرف مکمل ویرانی چھا گئی۔

سیمنٹ کے اونچے چھجوں سے جھانکتی ہوئی میلی زرد روشنیوں میں بھاری بینچ پر وہ سر نیوڑھائے بیٹھا تھا کہ اچانک ڈاک گھر کے پچھواڑے سے نکل کر آتے ہوئے چند وردی والے اس کی طرف لپکے ۔ ایک کے ہات میں سندھی ٹوپی تھی ، جو اس کے سر پر رکھ دی گئی۔ پھر سب نے مل کر اسے اٹھایا۔ جیسے کسی معذور کو اپنے ساتھ سہارا دے کر لیے جاتے ہوں۔

وہ سب جلدی میں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ، رابطہ پل پر سے گزار کر وہ اسے دوسری طرف لے گئے اور کھڑی ہوئی ٹرین کے چلنے سے پہلے ایک پرسکون ڈبے میں اسے سوار کروا دیا ۔ اسے اٹھا کر لے جانے کا منظر شاید کسی نے دیکھا ہو یا شاید سب کی نظریں چوک گئی ۔

اگلے روز رات کا پہلا پہر ہو گا۔ وہی پلیٹ فارم تھا اور وہی لوہے کا بھاری بینچ ، جس پر پختونوں والی ٹوپی اوڑھے ایک مسافر ، سر نیوڑھائے ، بڑے پرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔ جیسے زندہ ہو اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہو ۔

پان ، بیڑی ، سگرٹ کی چھابڑی اٹھائے ہوئے ایک لڑکے نے قریب سے گزرتے ہوئے اسے پہچان لیا۔

"ارے، یہ تو وہی ہے۔"

پھر لدے پھندے ٹھیلوں کو دھکیلنے والے قلی، نان پکوڑے والے چھوکرے اور ٹی اسٹال کے کارندے سب اکٹھے ہوگئے۔

"یہ آیا کہاں سے؟" کسی نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"خدا جانے صاحب۔"

"وضع قطع سے تو پختون دکھائی دیتا ہے۔"

"ہاں ---- شاید۔"

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گرد، ستے ہوئے چہروں اور نیند سے بوجھل آنکھوں والے لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہوتا چلا گیا۔

مظہر جمیل
۷۹ - بی - اخیابان بادبان
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی فیز ۱۱
کراچی -

"مٹی کا زنگ" کا تجزیہ

یوں تو "مٹی کا زنگ" معاشرتی صورت حال پر حقیقت پسندانہ (Realistic) اسلوب کی حامل کہانی ہے ، لیکن کمال تہہ داری اور بلیغ اشاریت کے ساتھ - ادھر حقیقت نگاری کا اسلوب جن ارتقائی مراحل سے گزرا ہے ، اس کے نتیجے میں اب حقیقت پسند افسانہ بھی محض ماجرائیت کا احوال اور حقیقت کی عکس بندی ہی کا نام نہیں رہ گیا ، بلکہ وہاں بھی معروضیت کے اظہار میں "کہی" سے زیادہ "ان کہی" اور جزئیات کی تفصیل نگاری کی بجائے ایمائیت ، اشاریت اور علامت کے جادو جگائے جانے لگے ہیں - آج کا حقیقت نگار واقعاتی خبر اور ماجرائیت کے بیان پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کی بیشتر توجہ کا محور وقوعہ سے پیدا ہونے والے رویّے ، احساس اور انداز نظر تک رسائی بھی ہوتی ہے - وہ خارجی حقیقت کے ساتھ ساتھ ماورائے حقیقت بھی دیکھتا ہے - اب یہ بات افسانہ نگار کی اپنی صلاحیت ، استعداد اور ہنر مندی پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ کس حد تک اپنے قاری کا اعتبار حاصل کر پاتا ہے کہ وہ (قاری) بھی افسانہ نگار کے ساتھ ان ماورائے حقیقت عناصر کو دیکھ پائے جن کی نشاندہی اور اظہار ، فن کار کا مقصود رہا ہے۔ اگر فن کار نے واقعاتی واردات کو منطقی مگر غیر جذباتی نکتہ نظر سے دیکھا ہے اور ظاہری حقیقت کے اقتباس سے حقیقی جوہر کو جدا کرسکنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس صورت حال سے پیدا ہونے والے احساس کی آنچ کو اپنی سانسوں میں سمو لینے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے تو پھر اس کے لیے ایسا بیانیہ لکھنا یقیناً ممکن ہو سکے گا جو مؤثر بھی ہو اور معنیاتی تہہ داری کا حامل بھی ، لیکن حقیقت کے اظہار میں اگر محض اسماء و اشیا کا جہاں ہی اس کی جولاں گاہ ٹھہرتی ہے تو پھر وہ سپاٹ رپورٹنگ اور اکہرے بیانیہ کے سوا کچھ تخلیق نہیں کرسکتا - اسی طرح اگر اس کے برعکس دور از کار خیال آفرینی افسانہ نگار کی رہنما ٹھہرتی ہے تو پھر حقیقت کے بطن سے پھوٹنے والے احساس تک رسائی حاصل کرنے کی بجائے شاعرانہ فن تاسی Fantacy سے آگے نہ جا سکے گا۔ اس نکتہ نظر سے زیر تبصرہ کہانی

کو پڑھیے تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ محض ایک خاص واقعہ کا یک رخا بیان نہیں ہے بلکہ اس خاص واردات کے حوالے سے دراصل اس بے دردانہ اور یخ بستہ بے حسی کی صورت گری کی گئی ہے جو آہستہ آہستہ ہمارے معاشرتی رویوں میں سرایت کرتی جارہی ہے۔ یہی بے حسی آج انسان کا سب سے بڑا آشوب ہے، جس نے انسان کو انسان سے بے گانہ بنا رکھا ہے۔

"مٹی کا زنگ" اس مرنے والے کی کہانی تو ہے ہی جو دوران سفر موت کا شکار بن جاتا ہے اور جس کی لاش ریلوے پلیٹ فارم پر رکھی ہوئی لوہے کے ایک خالی بینچ پر پائی جاتی ہے، جہاں وہ مردہ شخص اس طرح سرنیہوڑائے پرسکون انداز میں بیٹھا ہوا ملتا ہے، جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ کسی کو کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں سے آیا تھا اور کدھر جارہا تھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کے پاس کوئی سامان سفر تھا بھی یا نہیں اور اگر تھا بھی نہ جانے کون اٹھائی گیرا سے لے اڑا تھا۔ اب وہ محض ایک تہی دست اور بے نام و نشان لاش تھی جو کسی پلیٹ فارم کی بینچ پر دھری ہوئی تھی، بہ ظاہر زندہ آدمی کی طرح لیکن ساکت، جامد، اور بے روح۔ زندہ لوگوں کا ہجوم آس پاس موجود ہے، سب ہی کو اس کے حالات جاننے کا اشتیاق ہے۔ سب ہی اس سے ہم دردی کا اظہار بھی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس کا نام و نشان مل ہی جائے کہ بے چارے کی مٹی ٹھکانے لگے۔ ریلوے کے محکمے کے لوگ بھی آتے ہیں لیکن بس دیکھ بھال کر غائب ہوجاتے ہیں۔ واچ اینڈ وارڈ والے اسے اس لیے بات نہیں لگاتے کہ ان کے خیال میں یہ کیس ان کے تھانے کی حدود سے تعلق نہیں رکھتا، وہ سمجھتے ہیں کہ مرنے والا کسی دوسرے علاقے میں مرا ہے اور نامعلوم کہ کون اس کو کسی ٹرین پر لاکر اس پلیٹ فارم پر بٹھا گیا ہے۔ حالاں کہ وضع قطع سے وہ مقامی آدمی معلوم ہوتا ہے، واچ اینڈ وارڈ والے جانتے ہیں کہ اگر انھوں نے اس معاملہ میں دل چسپی لی تو پھر انھیں لمبی چوڑی اور تھکا دینے والی کاروائیوں سے گزرنا ہوگا۔ انھیں مرنے والے کا اتا پتا ڈھونڈنا ہوگا۔ اس کی موت کے اسباب جاننے ہوں گے۔ اس بات کی تصدیق کرنی ہوگی کہ کہیں اس کی موت غیر طبعی طریقہ پر تو نہیں ہوئی وغیرہ۔ ظاہر ہے یہ ساری باتیں ایک طویل کاروائی کا پیش خیمہ ہوسکتی تھیں! آتے جاتے لوگ بھی اس صورت حال پر غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ مرنے والے کی بے چارگی پر ہم دردانہ تاسف بھی کرتے ہیں، انھیں اس بات کے ننے کی بھی بڑی فکر رہتی ہے کہ بے چارا نہ جانے کون تھا، کہاں جارہا تھا۔ اب اس کا

آخری انجام کیا ہوگا ، بھانت بھانت کے لوگ جمع ہوتے ہیں ، کچھ دیر معاملہ میں دل چسپی لیتے ہیں لیکن عملاً کچھ نہیں کرپاتے کہ سب کو خواہ مخواہ گواہی میں پھنس جانے کا اندیشہ ہے۔ کسی کو فکر ہے کہ کہیں اس کی منزل کھوٹی نہ ہوجائے ، کسی کو اپنی ٹرین چھُٹ جانے کا خوف لاحق ہے۔ سب چاہتے تو ہیں کہ لاوارث لاش کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کیا جائے لیکن ہر ایک عملاً خود کو اس معاملہ سے دور ہی رکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ واچ اینڈ وارڈ آتے بھی ہیں تو بس ادھر ادھر جھانک کر چلے جاتے ہیں کہ ان کی نظر میں معاملہ ان کی حدود کے باہر کا ہے ۔ کچھ رات گئے جب بھیڑ ذرا چھٹتی ہے تو واچ اینڈ وارڈ کے دو تین سپاہی نمودار ہوتے ہیں ، وہ ایک سندھی ٹوپی لاش کو پہناتے ہیں اور اس کی بغل میں ہات دے کر اس طرح اٹھاتے ہیں جیسے کسی بیمار کو سہارا دے کر چلا رہے ہوں ۔ وہ لاش کو رابطہ پل کے ذریعہ سے دوسرے پلیٹ فارم پر مخالف سمت سے آنے والی گاڑی کے کسی خالی ڈبے پر بٹھا دیتے ہیں اور اس طرح وہ اس مصیبت سے فرضی طور پر ہی سہی ، چھٹکارا پاتے ہیں ۔ لیکن ستم ظریفی دیکھیے کہ اگلے روز رات کا پہلا پہر ہوگا وہی پلیٹ فارم تھا ، اور وہی لوہے کا بھاری بنچ جس پر پختونوں والی ٹوپی اوڑھے ایک مسافر سرنیہوڑائے ، بڑے پرسکون انداز میں بیٹھا ہے جیسے زندہ ہو اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہو ۔

پان بیڑی ، سگریٹ کی چھاپڑی اٹھائے ہوئے ایک لڑکے نے قریب سے گزرتے ہوئے اسے پہچان لیا .... " ارے یہ تو وہی ہے " پھر لدے پھندے ٹھیلوں کو دھکیلنے والے قلی ، نان پکوڑے بیچنے والے چھوکرے اور ٹی اسٹال کے کارندے سب اکٹھے ہوگئے ۔
" یہ آیا کہاں سے .... ؟ " کسی نے حیرت کے ساتھ پوچھا " خدا جانے صاحب " ۔
" وضع قطع سے تو پختون دکھائی دیتا ہے " ۔ " ہاں .... شاید " دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گرداگرد ، ستے ہوئے چہروں اور نیند سے بوجھل آنکھوں والے لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوتا چلا گیا ۔

پھر وہی بھیڑ ، وہی تبصرے ، وہی اندیشہ ، وہی ہمدردیاں اور وہی بے حسی ۔ یہ کہانی ایسے اختتام کے باوجود بھی دراصل ختم نہیں ہوتی بلکہ ایک مسلسل چکر کی طرح پھر چل پڑتی ہے ۔ دائرہ در دائرہ ۔ کہانی کا یہ دوسرا دور افسانہ نگار نے تو نہیں لکھا ہے لیکن قاری احساس کی سطح پر اسے تخلیق کرتا ہے اور اس طرح فن کار اپنے پڑھنے والے کو بھی تخلیقی عمل میں

شامل کر لیتا ہے جو اس کی فن کارانہ چابک دستی اور ہنر مندی کی دلیل فراہم کرتی ہے۔ تعینیاتی سطح پر یہ کہانی کتنے ہی ایسے اہم اور چبھتے ہوئے سوال اٹھاتی ہے جس کے جواب قاری کو تلاش کرنے ہیں ۔ فرد کی شناخت بس اسی وقت تک قایم ہے جب تک کہ اس کا وجود سانس کی ڈوری سے بندھا ہوا ہے اور اس ڈوری کے ٹوٹتے ہی وہ محض ایک بے نام و بے شناخت لاش ہے جس کا نہ کوئی وارث ہے اور نہ حلیف ۔ مٹی جو کبھی اس کا جوہری عنصر تھا، اب مٹی کے زنگ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ جس کی نہ کوئی اہمیت ہے نہ پہچان ۔ آس پاس زندہ لوگ ، چلتی پھرتی بھیڑ، ان کے ظاہری خلوص و ہمدردی اور اندیشے سب بے معنی اور کھوکھلے ہیں ۔ معاشرتی ادارے ، قانونی اور انتظامی محکمے اپنی اپنی ضرورت کے تحت لاشوں کو من مانی ٹوپیاں پہناتے چلے جاتے ہیں ، لیکن کوئی بھی اس جاں دادہ راہ مسافر کی اصل تک پہنچنے کی نہ تو خواہش رکھتا ہے اور نہ مہلت ۔ ایک یخ بستہ بے حسی نے آس پاس کی ساری فضا کو منجمد کر کے راکھ دیا ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان موجود رشتے بھی اس یخ بستہ بے گانگیت کی زد میں آکر ٹھٹھر کر رہ گئے ہیں ۔ اس قسم کے حوادث سے نپٹنے کی ذمہ داری جن انتظامی اداروں پر عاید ہوتی ہے ، وہ قانونی موشگافیوں اور مجرمانہ تن آسانیوں میں الجھے ہوئے ہیں اور اصل مسئلہ کو اپنی حدود سے نکال کر دوسرے کی حدود میں پھینک دینے ہی کو مسئلہ کا حل جانتے ہیں ۔ یہ صورت حال مروجہ انتظامی ڈھانچے کی ناکارکردگی ، تن آسانی اور اخلاقی دیوالیہ پن کی نشاندہی تو کرتی ہی ہے لیکن سب سے زیادہ الم ناک بے حسی وہ شخصی اور معاشرتی رویہ ہے جو انسانی زندگی کی اس بے وقعتی پر پلیٹ فارم پر جمع ہونے والے افراد اور بھیڑ کی جانب سے ظاہر ہوتا ہے ، جس سے نہ تو کوئی احتجاجی رد عمل مرتب ہوتا ہے اور نہ غم و غصہ کا اظہار ۔ جیسے کسی زندہ انسان کا دفعتاً موت سے ہم کنار ہو جانے کا واقعہ ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کے لیے بھی محض ایک تماشا بن کر رہ گیا ہو ! لیکن یہ ساری وضاحتیں کہانی میں کہاں کی گئی ہیں ؟ جی ہاں ۔ کہیں نہیں کی گئی ہیں ، بلکہ یہ سب ان کہی باتیں اور سوال کہانی کے بین السطور سے ابھرتے ہیں ، جو جدید حقیقت نگاری کے اسلوب کا نہایت دل کش اور مؤثر رنگ ہے اور جس سے کہانی کے تاثر میں مزید گہرائی اور وسعت پیدا ہو گئی ہے ۔ یہ وہ طریق کار ہے جو اسلام آباد فکشن گروپ کے ذریعہ جدید افسانہ نگاری کو بالخصوص عطا ہوا ہے۔ اور اسی طریق کار نے Realist افسانے کو اکہرے پن سے نجات

دلا کر معنیاتی دبازت اور تہہ داری بخشی ہے۔

ہر چند مجھے افسانہ نگار کا نام بوجھنے کا قطعی کوئی شوق نہیں ہے اور نہ میں خود کو اس بات کا اہل ہی جانتا ہوں لیکن زیر نظر کہانی کو بار بار پڑھنے کے بعد میں اسے اسلام آباد فکشن گروپ ہی کے کسی چابک دس فن کار کی تخلیق سمجھتا ہوں۔ جہاں تک (ڈاکٹر) رشید امجد کا سوال ہے تو وہ اسلوب اور اظہار کی ایسی گہری چھاپ رکھتے ہیں کہ اسے الگ سے پہچان لیا جائے جو مجھے اس کہانی کے بیانیہ میں نظر نہیں آتی۔ اسی طرح محمد منشا یاد کی فنی گلوسری، ڈکشن اور مخصوص لہجے کی عدم موجودگی بھی اس کہانی کو ان سے منسوب نہیں ہونے دیتی۔ اب رہ گئے خالدہ حسین اور مرزا حامد بیگ (ڈاکٹر) یا دونوں نہیں۔ کہ نہ تو اس میں خالدہ حسین کی ماورائیت ہے اور نہ مرزا حامد بیگ کی داستان گوئی کا طلسم۔ مزید یہ کہ کیا یہ دونوں اس حد تک معروضی حقیقت نگاری تک اتر بھی سکتے ہیں کہ یادش بہ خیر خالدہ حسین گزشتہ دنوں منشا یاد پر پریم چند کے سایہ میں پناہ تلاش کرنے کی پھبتی کس چکی ہیں اور مرزا حامد بیگ تو نظری طور پر معروضی حقیقت نگاری کو افسانہ نگاری کا زوال آمدہ اسلوب بتا ہی چکے ہیں۔ واللہ عالم بالصواب

آخر میں صرف ایک گزارش اور .... یہ کہانی کم و بیش چوبیس گھنٹوں کے دورانیہ پر محیط ہے کہ پہلی مرتبہ لاش رات کے پہلے پہر میں دریافت ہوتی ہے اور دوسرے دن رات کے پہلے پہر ہی اس جگہ لوٹ آتی ہے، جہاں سے چلی تھی۔ تو اس طرح چوبیس چھبیس گھنٹے گزر جانے کے باوجود لاش میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، وہ اسی طرح سر نہیوڑائے پرسکون انداز میں بیٹھے ہوئے ملتی ہے جیسی کہ کہانی کے آغاز میں تھی۔ یہ امر محال کیسی الجھن پیدا کر رہا ہے۔ اور کیا افسانہ نگار اپنے قاری کو اس الجھن سے بچا نہیں سکتا تھا؟

مرزا حامد بیگ

سانڈنی سوار

میں نے جو کچھ اپنے مرحوم باپ کی زبانی سنا، اسے والدہ مرحومہ کی آنکھوں سے دیکھا۔

قبلہ والد صاحب جہاں حقیقتِ احوال میں اُلجھ کر رہ جاتے، وہاں میری والدہ محترمہ لقمہ دیتیں اور چونکہ مجھے ہمیشہ سے دوسروں کی آنکھوں دیکھی کا بیان مسحور کرتا چلا آیا ہے، اس لیے کبھی اس بات سے غرض نہیں رکھی کہ کہاں میری جنتی ماں خاموش رہی اور کہاں کہاں میرے باپ نے غلط بیانی سے کام لیا۔

کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ، مجھے اس سے کچھ غرض نہیں۔ بیان دل نواز ہے اور کہانی مرغوب۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ پیرومرشد بعد نماز مغرب اپنے مدرسے میں درس دے رہے تھے۔ مدرسہ کیا تھا، مل بیٹھنے اور سر ٹیکنے کا ایک بہانہ تھا۔ چھدرے چھپر کے نیچے قبلہ کے رُخ پر ایک بھاری چٹان کو کاٹ کر منبر بنالیا گیا تھا، جس کے عین اوپر مٹی کا ایک دِیا ٹمٹماتا تھا۔ فرش پر گھاس پھونس کی تہہ جمی تھی، جس پر اعلیٰ حضرت کے علاوہ کل چار نفوس تھے، جو ہمہ تن گوش تھے۔

پیرومرشد نے منبر سے ٹیک لگا کر اپنی ایک ٹانگ کو سامنے کی سمت پھیلا رکھا تھا اور نہایت بے تکلفی سے بیان فرما رہے تھے۔ علم کا ایک دریا موجزن تھا، جس کے کناروں کی کہیں اور چھور نہ ملتی تھی۔ ایسے میں دروازے پر دستک ہوئی اور دس بارہ جوان بلا اجازت اندر داخل ہوئے۔ ایک کے بعد ایک، سر جھکائے ہوئے۔ سب سے آگے اونچی دستار اور بھاری جبّے میں ملبوس ایک دراز قد نوجوان تھا، جو خاموشی کے ساتھ ایک طرف ہو کر بیٹھ رہا۔ پھر باقی جوان آئے اور نہایت ادب کے ساتھ اس کے پیچھے صف بستہ کھڑے ہو گئے۔

دِیے کی مدھم روشنی میں نواردگان کے چہرے مہروں سے ان کی پہچان مشکل تھی، البتہ ان کی جوانی اس ملگجے اندھیرے سے چھلکی پڑتی تھی۔ حضرت صاحب نے اپنی ٹانگ کو سمیٹ لیا اور آلتی پالتی مار کر سیدھے ہو کر بیٹھ رہے۔ اونچی دستار والے جوان نے گردن کی

ہلکی سی جنبش کے ساتھ اپنے پیچھے صف بستہ ساتھیوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ جہاں جہاں کھڑے تھے، وہیں دو زانو ہو گئے۔

اعلا حضرت نے شاید یہ سوچ کر کہ ایک دوسرا عالم ان کا بیان سن رہا ہے، نہایت محتاط انداز سے اپنی گفتگو جاری رکھی اور زیر بحث مسئلے کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے گھڑی کی گھڑی درس روکا اور دستار والے جوان کی طرف متوجّہ ہوئے:

"خوش آمدید ۔۔۔ آپ نے اپنی آمد اور مسلک سے مطلع نہیں فرمایا۔ نہ تو اپنا تعارف کروایا اور نہ ہی آمد کا سبب بتایا۔"

اونچی دستار والے نوجوان نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے ہکلا کر کہا:

"جی بس ویسے ہی آگیا تھا۔ آپ کا دیدار کرنے۔"

اعلا حضرت نے دریافت فرمایا:

"اور آپ کا نام؟"

"جی، مجھے جوسف کہتے ہیں۔"

"جوسف۔"

حضرت صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "جوسف۔ جوسف کیا؟" وہ زیر لب بڑبڑائے اور دیوار سے ٹیک لگاتے اور اپنی ٹانگ کو دوبارہ سامنے کی سمت پھیلاتے ہوئے طالب العلموں سے فرمایا:

"اس کی اونچی دستار اور بھاری جبّے پر نہ جاؤ، یہ تو جوسف ہے۔"

کہنے والے نے کہا کہ اس کے بعد اعلا حضرت نماز عشاء تک مسائل کا بیان فرماتے رہے اور ان جوانوں کی طرف کوئی توجّہ نہ دی۔ نماز کے فوراً بعد اعلا حضرت نے سب کو اُٹھ جانے کی اجازت دے دی۔

میں ہمہ تن گوش تھا کہ میرے والد بزرگ نے کھُل کر قہقہ لگایا اور فرمایا:

"بیٹا، اس کا نام یوسف تھا۔ جاہل، ایک عالم کی محفل میں آگیا تھا۔ اس نے علما کے لباس کی توہین کی۔ بیٹے جبّہ اور قبّہ صرف عالموں کو جچتا ہے۔"

میں سنتا رہا اور اپنے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہا۔ اس وقت مجھے جوسف پر ترس آرہا تھا اور میرے والد بزرگ اسے برا بھلا کہتے ہوئے تادیر تمبا کو پیتے رہے تھے۔ پھر یک لخت

میرے باپ نے زور سے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا:

" دوسری بار پیرو مرشد سے اس کا سامنا ہوا تو اعلا حضرت جنگل میں اپنی گھوڑی کے لیے گھاس کاٹ رہے تھے۔ تفُ ہے اس دنیا کے نظام پر، کہ اپنے وقت کا جنیّد عالم اپنے مبارک ہاتوں سے گھاس رچھیل رہا ہے اور وہ، جن کے سروں میں بھُس بھرا ہے، حکومت کر رہے ہیں۔ حیف صد حیف ۔۔۔۔

ایسے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گھڑ سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہُوا آیا۔ اس نے چہرے پر نقاب باندھ رکھا تھا اور اس کے لباس پر گرد جمی تھی۔ وہ گھوڑے سے اترا اور بغیر سلام دعا کے اور ادب آداب کا لحاظ کیے، کہنے لگا:

" میرے گھوڑے کی زین کے ساتھ ایک گائے کی کھال لٹک رہی ہے، جس میں ایک لاکھ درہم ہیں۔ اس کے بوجھ تلے میرا گھوڑا دوہرا ہو چلا ہے اور مجھے اس کی حاجت نہیں۔ تم مجھ سے اپنا بوجھ بدل لو۔ یہ گھاس کا گٹھا مجھے دے دو اور یہ ایک لاکھ درہم تم لے لو۔ "

جانتے ہو پیرو مرشد نے جواب میں کیا فرمایا؟ اعلا حضرت نے حقارت سے کہا:

" تو کردستان سے آیا ہے۔ تیری کمر سے ہندی تلوار بندھی ہے۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ میں تجھے نہیں جانتا۔ میں جانتا اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ چلا جا۔ تجھے تو بات تک کرنے کا سلیقہ نہیں۔ "

یہ سن کر گھڑ سوار نے اپنے چہرے سے نقاب اتار پھینکا، ماتھے کا پسینہ پونچھا اور چپ چاپ کھڑا رہا۔ اعلا حضرت کے قربان جایے، آپ نے اسے خوب پہچانا تھا، وہ جاہل جوسف ہی تھا، جو کچھ دیر تو اسی طرح خاموش اور گم سم کھڑا رہا، پھر گھوڑے پر بیٹھ کر ہوا گیا۔

اعلا حضرت گھاس کا گٹھا سر پر اٹھائے اپنے آستانے پر پہنچے تو پتا چلا کہ وہ ادھر آیا تھا اور گائے کی کھال، جس میں پورے ایک لاکھ درہم بھرے تھے، ان کی چوکھٹ پر پھینک گیا ہے۔

کسی نے مشورہ دیا کہ لوٹ مار کے مال کو پاک کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے اعلا حضرت کے قائم کردہ مدرسے پر لگا دیا جائے تاکہ علم کی روشنی پھیلے اور جہالت مٹ جائے سو یہی کچھ ہوا۔ "

قبلہ والد صاحب یہ فرما کر خاموش ہوگئے۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ مدرسہ عالیہ تو قائم ہو گیا لیکن مفلوک الحال طالب العلموں کی حالت زبوں ہی رہی۔

زمانے بیت گئے۔

اب اعلا حضرت بہت ضعیف ہو گئے تھے اور حجرے سے باہر بہت کم نکلتے تھے۔ ایک روز مدرسے کے صدر دروازے پر ایک سانڈنی سوار آکر رُکا، جو منزلیں مارتا ہوا آیا تھا اور اعلا حضرت سے ملاقات کا خواہاں تھا۔

اور یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ وہ دراز قد سانڈنی سوار کبھی لاکھوں میں ایک رہا ہوگا، لیکن اس وقت اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے اور سر کے بال باہم جڑ کر ایک ہو گئے تھے۔

سانڈنی سوار کون تھا اور کہاں سے آیا تھا، اس کی کسی کو خبر نہ تھی پر وہ جس کی سمت نظر بھر کر دیکھتا، اس کی کایا پلٹ کر رکھ دیتا۔ طبیعتوں کو دنیاوی آفات اور دلوں کو مکروہ خواہشات سے آزاد کر دیتا۔

مدرسے کے طالب العلموں کو اس سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ قرُب و جوار کی آبادی اسے دیکھنے کی خواہش میں ہلکان ہو رہی تھی اور وہ خود اعلا حضرت سے ملاقات کی خواہش میں بغیر کھائے پیے وہاں تین دن اور تین راتیں رکا۔

مدرسے کی انتظامیہ کے بہت سمجھانے، بُجھانے اور دھتکارنے پر بھی وہ ٹَس سے مَس نہ ہوا تو اعلا حضرت اپنے حجرے سے باہر تشریف لائے اور سانڈنی سوار کو مدرسے کے صحن میں بلا کر صدر دروازہ مقفل کروا دیا۔

جب اعلا حضرت نے سانڈنی سوار کو اور سانڈنی سوار نے اعلا حضرت کو روبرو پایا تو دونوں دیر تک ماضی کے دھندلکوں میں کھوئے رہے اور چپ چاپ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ باہر صدر دروازے پر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے تھے اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ آخرکار اعلا حضرت نے سانڈنی سوار کی بے باک نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے فرمایا:

"جاؤ بھائی اپنا کام کرو۔ یہاں طالب العلم بستے ہیں۔"

اعلا حضرت نے صرف اتنا کہا اور اپنے حجرے کی طرف نکل گئے۔

سانڈنی سوار نے نظر بھر کر مدرسے کے صحن میں مفلوک الحال زرد رو طالب العلموں کو درس میں منہمک دیکھا اور نہایت دھیمی آواز میں بولا:

"میں تو چلا ---- تم اپنی فکر کرو۔"

اتنا کہہ کر وہ صدر دروازے کی چوکھٹ پر گرا اور دم دے گیا۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ وہ سانڈنی سوار جوسف ہی تھا جو پہلی بار طالب العلم بن کر آیا تھا، جب اسے دھتکار دیا گیا۔ پھر وہ ڈاکو لٹیرا بن گیا اور جب آخری بار آیا تو موت بھی اس کے اختیار میں تھی۔

اعلا حضرت اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے اور مدرسے کے وسیع و عریض صحن میں صدر دروازے کے قریب سانڈنی سوار پڑا تھا۔ درس کے اختتام تک اس کی موت کا کسی کو بھی علم نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ عصر کے قریب چند طالب العلم اس طرف آئے اور اسے وہاں سے اٹھایا۔ ایک طالب العلم نے ڈرتے ڈرتے صرف اتنا کہا:

"بھائیو ---- یہ تو اعلا حضرت سے بھی بازی لے گیا۔"

میری جنتی ماں بھی اسی نتیجہ پر پہنچی تھی البتہ والد بزرگ نے ہمیشہ اس سے اختلاف کیا۔ ان کے خیال میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسے جیتے جی گائے کی کھال میں سی کر دھوپ میں ڈال دیا جاتا، تاوقتیکہ اس کی ہڈیاں کڑکڑا اٹھتیں۔ مدرسہ عالیہ کا صدر دروازہ کہاں اور وہ لعین کہاں۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ مدرسے کا صدر دروازہ اس وقت تک نہ کھولا گیا، جب تک کہ سانڈنی سوار کو نہایت عجلت میں وہیں دفن نہ کر دیا گیا۔

قرب و جوار کی آبادی بہت دنوں تک گومگو کے عالم میں رہی۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا، کچھ پتا نہ چل سکا۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ مدرسے کے صدر دروازے پر ایک مریل سانڈنی اب بھی اپنے سوار کا انتظار کر رہی ہے۔

★

غلام حسین ساجد

صدر دروازے کا پھول

(مرزا حامد بیگ کی کہانی "سانڈنی سوار" پر گفتگو)

" میں نے جو کچھ اپنے مرحوم باپ کی زبانی سنا۔ اسے والدہ مرحومہ کی آنکھوں سے دیکھا"۔ یہ ہے وہ جملہ جس سے مرزا حامد بیگ کی کہانی " سانڈنی سوار " کا آغاز ہوتا ہے سوال یہ ہے کہ اس جملے کی حیثیت صرف آغاز کلام کی سی ہے یا اس کے ذریعے کہانی کار اپنی ذات کے کسی پے چیدہ تجربے کو ہمارے روبرو لاکھڑا کرنا چاہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کہانی " سانڈنی سوار " کی تفہیم کے لیے اس جملے کی حیثیت کلیدی نوعیّت کی ہے اور اس جملے میں متعارف ہونے والے کردار یعنی کہانی کار کے ماں ، باپ ، معاشرتی وجود کے ان دو پہلوؤں کے نمایندہ ہیں جو ہمارے استعماری نظام کا لازمہ ہیں کہ ان میں سے ایک طاغوتی جبر کی موجودگی کا ضامن اور پشت پناہ ہے تو دوسرا شعوری ابھار کی معصومانہ رستخیز کا ایک خاموش مداح۔

" سانڈنی سوار " ایک ضابطہ پرست عالم اور ایک متلوّن مزاج طالب العلم کی فطرت کے مابین تضّاد اور جدل کی کہانی ہے جو آگے بڑھ کر ہمارے اطراف میں فروغ پاتے ہوئے جبر اور ہمارے باطن میں نمو پاتی ہوئی آزادی فکر کے مابین تصادم کی امین بن جاتی ہے۔

کہانی " سانڈنی سوار " کا آغاز نماز مغرب کے بعد کے نرم رو دھند لکے سے ہوتا ہے اور ایک ایسے مدرسے کے منظر پر کھلتا ہے جس میں دیہات کی کشادگی اور عسرت کا امتزاج ہے اور جس کے کرداروں پر اپنے اصل سے گریز کرنے کا شبہ تک نہیں کیا جاسکتا مگر اس شانت اور اپنے تسلسل میں رکی ہوئی فضا میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوتا ہے جو اس درس گاہ کے غیر روایتی وجود کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اس قدر کہ اس مدرسہ کے وارث اور روح رواں اعلا حضرت ، ایک ہی جست میں اپنی نوع کے دیگر روایتی علما کی جانی پہچانی صف میں جاکھڑے ہوتے ہیں۔

یہ واقعہ " یوسف " کی آمد ہے۔ ایک خوش حال اور خوش لباس طالب العلم جسے طلبِ علم کی شدید خواہش تو ہے مگر وہ طلبِ علم کے آداب اور مدارج سے آگاہ نہیں یہی

سبب ہے کہ وہ اپنی خوش لباسی کے باوجود اعلا حضرت کی نگاہ میں بار نہیں پاتا بلکہ سچ یہ ہے کہ جستجوئے علم و فضل میں ہر بار تحقیر ہی اس کا مقدّر بنی ہے۔ ایک طالب العلم کی حیثیت سے، ایک ڈاکو کے روپ میں اور ایک عالم کے طور پر اُسے کبھی توجّہ کے لائق نہیں جانا گیا۔ جبھی تو وہ ہر بار ٹوٹ کر رہ جاتا ہے اور اپنی جون بدلنے ہی میں عافیت جانتا ہے مگر آخری بار ایسا ممکن نہیں ہو پاتا (کہ عرفان ذات کی اس منزل پر کہ جہاں تک پہنچ چکا تھا، سے مراجعت کا راستا ہی نہیں) تو وہ مدرسہ، عالیہ کے صدر دروازے کی چوکھٹ پر ڈھیر ہو جاتا ہے کہ واپس پلٹنا اس کی تقدیر میں نہیں اور ایک ولی کی سطح سے آگے بڑھنے کی استطاعت اس کے وجودِ ناقص کے بس میں نہ تھی۔

رہے "سانڈنی سوار" کے اعلا حضرت تو وہ اپنے تمام تر تبحّر علمی اور پُرہیبت شخصیت کے باوجود ایک روایتی مُلّا کی سطح سے کبھی بلند ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی طرزِ عمل اختیار کرتے اور دما دم رواں یم زندگی کے شور و شر میں ایک ہی علمی مرتبے اور مقام پر جمے کھڑے نظر آتے ہیں جب کہ "سانڈنی سوار" یوسف کی شخصیت میں ہر بار ایک ایسی انوکھی تبدیلی وقوع پذیر ہوتے دکھائی گئی ہے۔ جس کی پیش بندی کرنا قاری کے لیے آسان نہیں۔ طالب العلم سے ڈاکو اور ڈاکو سے ولی بننے تک اگرچہ ہم اس کی زندگی کے صرف تین دنوں کی کیفیّت ہی سے روشناس کرائے گئے ہیں۔ پھر بھی ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی کہ زندگی کی بوالعجبیوں اور تہہ داری کا تجربہ صرف یوسف ہی کے حصّے میں آیا ہے جبھی تو اس کے وجود کی کایا کلپ اور اس عدم میں مسلسل تبدیلی وقوع پذیر ہوتی رہتی ہے۔

مرزا حامدؔ بیگ کے اس افسانے کی ساری عمارت بہ ظاہر ایک معصوم بچے کی فوٹو جینک یاداشت کے بل بوتے پر کھڑی ہے مگر حقیقت میں اس کہانی کا خمیر ہمارے معاشرتی جبر کے تسلسل سے اٹھایا گیا ہے، جس نے ہماری عقیدت، ہماری فکر اور علمی استعداد کی Conditioning ہی نہیں کی ہمارے وجود کے بے ساختہ پن کو بھی دھندلا دیا ہے جبھی تو اعلا حضرت کے مدرسہ عالیہ کی چار دیواری میں پلنے والے طلبہ کے وجود اس کہانی کے پیش منظر پر کہیں بھی ایک ناتواں سائے سے زیادہ نمایاں ہونے کی سعی نہیں کرتے۔ ہاں! صرف ایک بار، صرف ایک لمحے کے لیے ہم انسانی وجود کے بے ساختہ پن اور آزادی فکر کی

ایک بے ساختہ رو کو رواں ہوتے ہوئے دیکھ پاتے ہیں جب عصر کی ساعت زوال میں مدرسہ عالیہ کے مدقوق طالب العلم یوسف کو صدر دروازے کی چوکھٹ پر مردہ دیکھتے ہیں۔

"ایک طالب العلم نے ڈرتے ڈرتے صرف اتنا کہا:

بھائیو! یہ تو اعلا حضرت سے بھی بازی لے گیا"

اگرچہ ہمیں اس طالب علم کی بے ساختہ سچّائی کی حمایت میں کہیں کوئی اور آواز اٹھتی دکھائی دیتی ہے نہ حضرت صاحب کے تبحّر علمی اور دینی و دنیاوی مرتبے کوکوئی ضعف پہنچنے کا احتمال پیدا ہوتا ہے مگر ایسا ہے کہ داستان گو کی ماں کا طالب العلم کے لاشعوری فیصلے سے اتفاق کرنا، اس شعور کے موجود ہونے کی نشان دہی کر ہی دیتا ہے، جسے پروان چڑھنے سے روکنے اور ہمیشہ کے لیے جڑ سے اکھاڑنے کو سانڈنی سوار کی آمد پر مدرسہ عالیہ کا صدر دروازہ اندر سے بند کردیا گیا تھا۔

کہانی کے اس مرحلے پر یہ بات بھی کھُل کر سامنے آتی ہے کہ اس کہانی کا راوی یعنی کہانی کار کا باپ، اسی ماحول اور معاشرتی جبر میں ڈھلا ہے جس کی سب سے واضح علامت، مدرسہ عالیہ کے اعلا حضرت ہیں جبکہ کہانی کار کی ماں، آزادی فکر کے اس شعوری بہاؤ کی گواہ بن کر سامنے آتی ہے، جس کی تصویر کھینچنے کو یہ کہانی خلق کی گئی ہے۔ اگرچہ کہانی کار کو اس بات سے کچھ غرض نہیں کہ اس کہانی کا راوی کہاں کہاں غلط بیانی سے کام لیتا رہا ہے اور اس کی ماں نے کہ جس کی آنکھوں کے راستے سے وہ بذاتِ خود اس قصّے کا ایک ناظر ہے اور جو زوالِ عصریت اور زمانی تسلسل میں فطری انصاف کی اکلوتی علامت ہے، کہاں کہاں خاموش رہنے میں مصلحت جانی ہے اور کہاں کہاں کہانی کے باطنی مفہوم کے منّور کرنے کو لب کشائی کی ہے۔ پھر بھی یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں کہ وہ اس خواب آلود دھندلکے میں حق و صداقت کی نوخیز کیفیّت ہی کے پرورش پانے کا مشتاق ہے۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ ہمیں مدرسہ عالیہ کے اندر سے اپنے سانڈنی سوار کے حق میں ایک خوف زدہ آواز کے سوا اور کوئی صدا بلند ہوتے دکھائی نہیں دیتی اور مدرسہ عالیہ کے اطراف میں بھی کہانی کار کی جنّتی ماں کے علاوہ کسی فکری عمل کا پرتو موجود نہیں مگر کیا مدرسہ عالیہ کے قرب و جوار کی آبادی کا بہت دنوں تک گومگو کے عالم میں رہنا، آزادی فکر کی اس کونپل کا پتا نہیں دیتا، جس کے نشو ونما پاتے رہنے سے، ہم اس نوع کے جبر سے نجات ہی

حاصل نہیں کرلیں گے بلکہ اس جنگاہ ہستی سے بھی محفوظ رہیں گے کہ جس سے ہم اس کہانی کے مرکزی کردار یوسف کی طرح، اپنی زندگی کے دمِ آخر تک دو چار رہتے ہیں اور جس کے آخری مرحلے پر ہم صبحِ آزادی کی چوکھٹ پر دم تو دے سکتے ہیں مگر تاریکی کے حصار یں دم توڑتی، اپنی ہم شکل اور ہم قسمت مخلوق کے پانو کی بیڑیاں کاٹنے پر قادر نہیں ہوسکتے۔

کہانی کار نے یوسف، جو اس قصّے کا مرکزی کردار ہے، کی زندگی کے تین روپ ہمیں دکھائے ہیں۔ کہانی کے آغاز میں وہ ایک طالب العلم کی حیثیت میں ہمارے سامنے آتا ہے جو جُبّہ و دستار پہننے اور حواریوں کی ایک قابل ذکر تعداد رکھنے کے باعث طبقۂ اشرافیہ کی نمایندگی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ وہ علم و فضل کی دولت سے بے بہرہ ہے اور اس حقیقت کی اطلاع اس کے لہجے کی بدوبت سے ہوتی ہے جو اس کے جاہل مطلق ہونے پر صاد کرتی ہے۔ کہانی کے وسط میں وہ ایک لٹیرے کے روپ میں آتا ہے جس کی خورجین زر و جواہر سے لبریز رہتی ہے اور کہانی کے آخر میں وہ ایک ایسے عامل کے طور پر ہمارے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے کہ جس کا نظر بھر کر دیکھ لینا طبیعتوں کو دنیاوی آفات اور دلوں کو مکروہ خواہشات سے آزاد کر دیتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ سانڈنی سوار کے یہ تینوں روپ بظاہر مختلف ہونے کے باوجود، ایک دوسرے سے قطعی الگ اور غیر مربوط نہیں بلکہ ان تینوں زمانوں میں بھی کہ جن میں اس نے اپنی زندگی کے یہ تینوں رخ آزما دیکھے، ایک رابطہ بہر طور موجود دکھائی دیتا ہے۔ یہ رابطہ دراصل اس کی شخصیت کے عجز سے نمو پاتا ہے جو ہر مرحلے پر لپنے فطری انکساری کا اظہار کرتی ہے۔ گھاس پھوس کے چھدرے چھپر میں حاضر ہو کر دوزانو بیٹھنے، جنگل میں اعلا حضرت کے گھاس کے گٹھّے سے اپنی دولت کے بوجھ کو تبدیل کرنے کی خواہش رکھنے، اور مدرسہ عالیہ کے صحن میں اعلا حضرت کے روبرو خاموش کھڑے ہونے تک۔ یہ اس کی شخصیت کا عجزی ہے جو اسے بار بار اعلاحضرت کی طرف پلٹ آنے پر ہی نہیں اکساتا بلکہ اس کی ذات کی بار دگر کایا کلپ کا باعث بھی بنتا ہے۔ اس نے اس کہانی میں کہیں بھی لپنے عجز سے تجاوز نہیں کیا لپنے اختیار کی جھلک نہیں دکھائی، سوائے ایک بار کے، کہ جہاں وہ اعلا حضرت کے فخر سے شکستہ دل ہوکر مدرسہ عالیہ کے صحن میں محو درس مفلوک الحال طالب العلموں پر نگاہ کرتا ہے اور نہایت درجہ دھیمی آواز میں کہتا ہے:

"میں تو چلا ----- تم اپنی فکر کرو"

یوں لگتا ہے کہ وہ تفاخرِ علمی کی اس اساطیری فضا کو لپیٹ کر رکھ دے گا مگر اگلے ہی لمحے ، اس کا مدرسہ عالیہ کے صدر دروازے کی چوکھٹ پر لڑکھڑا کر گرنا اور دم دے دینا ، اس باطنی پیکار اور ردِّ عمل کی نشان دہی کرتا ہے جو اپنی ذات کے فطری بہاؤ سے انحراف کرنے کا لازمی نتیجہ ہوا کرتی ہے اور جس سے جان بر ہونا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

" سانڈنی سوار " ہمارے انٹروورٹ معاشرے کے لائق تعزیر صبر کی کہانی تو ہے ہی، ہمارے شعوری ابھار کی بے توقیری اور جدوجہد کی رائیگانی کا نوحہ بھی ہے۔ اس عصر میں اس کہانی کا لکھا جانا لازمی تھا کہ آج ہم بھی ، " سانڈنی سوار " کے یوسف کی طرح ، اپنے اطراف میں مصروف عمل جبر کے متحرک وجود کے مقابل گنگ کھڑے ہیں۔ مدرسہ عالیہ کا صدر دروازہ اندر سے بند ہے۔ باہر ایک بے چہرہ ہجومِ خلق ہے اور ایک مریل سانڈنی ، جو ہمارے ، اپنے قدموں پر چلتے ہوئے لوٹ آنے کے انتظار میں ہے۔

شاید! کبھی ایسا ہو کہ ہم لوٹ پائیں۔

مرزا حامد بیگ

کالی زبان

میں نے ایک شخص کو دیکھا، جس کی کمر اتفاق سے میرے سامنے ننگی ہوئی اور اس کمر پر ایسے نشانات تھے، جیسے گھوڑے کے جوڑوں کو پچھنے سے رہ جاتے ہیں۔

جب اس کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں اپنے سگے چچا کی بیٹی پر فریفتہ تھا۔ سو جان سے فدا، لیکن میں نے نکاح کا پیغام بھیجا تو میرے چچا نے ایک شرط رکھی ----- اور وہ شرط یہ تھی کہ میں بنی بکر کی سب سے تیز رفتار مشکی گھوڑی، "شبکہ" کو مہر میں دوں۔

میں نے بہ خوشی اس شرط کو قبول کیا اور اس فکر میں گھر سے نکلا کہ جس طرح بھی ہو، شبکہ کو اس کے مالک کے گھر سے نکال لاؤں۔ سو، میں نے لمبا سفر کیا اور بنی بکر کی آبادی تک پہنچا۔

اس وقت عشاء کی اذانیں ہو رہی تھیں اور میری خوش قسمتی کہ آبادی کے صدر دروازے پر مسافروں کو اپنے ہاں مہمان کرنے کو صرف ایک شخص رہ گیا تھا، اور وہ شخص وہی تھا، جس کے گھر کو میں سیندھ لگانے نکلا تھا۔ میں نے درویشانہ لباس پہن رکھا تھا اور کسی کو شک بھی نہ گزر سکتا تھا کہ اس آبادی تک میں کس نیت سے آیا ہوں۔

وہ ابی طاہر تھا، جو مجھ سے بہت اخلاص کے ساتھ پیش آیا۔ میرا سفری تھیلا اس نے اپنے کندھے پر ڈال لیا اور خوشی سے جھومتا ہوا، میرے آگے آگے چلا۔ راستے میں اُسی سے معلوم ہوا کہ گھر میں کل تین افراد ہیں۔ ایک وہ خود، ایک اس کی بیوی اور ایک غلام۔

وہ مجھے خوشی خوشی اپنے گھر کی طرف لیے جاتا تھا اور میں اس سوچ میں غلطاں کہ کس طور اس کی مشکی گھوڑی پر قبضہ کروں۔اس کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ دو کمرے ہیں۔ ایک میں میاں بیوی رات کو پڑ رہتے تھے اور دوسرے میں ان کا حبشی غلام۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ گھر کے صحن میں، چھپر کے نیچے میں نے پہلی بار شبکہ کو کھڑے دیکھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں اس کا سیاہ تاب رنگ لش لش کر رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک مشکی رنگ کی بچھیری بندھی تھی اور چند بکریاں۔

ابی طاہر کی بیوی نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ پھر اس نیک بخت نے اپنے

باتوں سے میرے لیے بستر درست کیا اور گرم پانی سے مُنھ ہات دُھلوا کر میرے سامنے کھانا چُن دیا۔ اس وقت مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی، میں نے جی بھر کر کھایا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ابی طاہر کے ساتھ قہوہ پیتے ہوئے میں بہت جلدی میں تھا، اور میرا میزبان میرے سفر کی روداد سننے کا متمنّی، لیکن مجھے اپنے مقصد کے حصول کے لیے وقت درکار تھا۔ اس لیے میں نے نیند کا بہانہ کیا اور آنکھیں مُوند کر لیٹ گیا۔ ابی طاہر نے میرے آرام کا خیال کرتے ہوئے بادلِ ناخواستہ شب بخیر کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے پھونک مار کر چراغ بجھا دیا اور دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ چاند کی مدھم روشنی میں، میں نے دیکھا کہ دونوں میاں بیوی نے صحن میں بیٹھ کر، مجھ سے بچے کچھے کھانے کے تین حصّے لگائے۔ ایک حصّہ غلام کے حوالے کیا اور بقیہ کھانا کھا کر برابر والے کمرے میں آرام کرنے کی غرض سے چلے گئے۔

غلام دن بھر کا تھکا ماندہ تھا، صحن میں چھپر کے نیچے پڑ کر سو رہا۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا۔ دو ایک کنکریاں غلام کی طرف اچھالیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ سوتا ہے یا جاگ رہا ہے۔ لیکن وہ بے خبر پڑا سو رہا تھا۔

اب میں نے اپنے سفری تھیلے میں سے گھوڑے کے ایال سے بنی ہوئی لگام نکالی اور صحن میں آگیا۔ گھوڑی کو آرام سے تھپکی دیتے ہوئے لگام پہنائی اور چور قدموں کے ساتھ اسے گھر سے باہر نکال لایا۔

اس وقت آسمان پر چھدرے بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں اور پورا چاند روشن تھا۔

پھر میں نے دیر نہیں کی۔ شبکہ پر بیٹھا اور ہوا ہو گیا۔

میں نے جب ایڑ لگائی ہے تو پیچھے ایک نسوانی چیخ سنائی دی اور اس کے بعد پوری آبادی کا شور پکارا۔ شاید میرے میزبان کی بیوی جاگ رہی تھی اور اس نے مجھے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

اس وقت میرے تعاقب میں ایک مخلوق نکلی لیکن میں تو اس وقت شبکہ کی پیٹھ پر سوار تھا اور وہ ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ ایسے میں کون مائی کا لال مجھے روک سکتا تھا۔

صبح کے آثار جاگنے تک میرے پیچھے آنے والے اکثر سوار ہانپ کر رہ گئے۔ ان میں

صرف ایک ایسا تھا جو مسلسل میرا پیچھا کر رہا تھا اور رہ رہ کر مجھے للکارتا تھا۔ میں سخت حیران، کہ ایسا جی دار اور برق رفتار آخر کون ہے۔ تاآنکہ اس نے میرے قریب پہنچ کر نیزے کا پہلا وار میری کمر پر کیا۔ اس کا نیزہ مجھے چھو نہ سکا۔ ایسے میں وہ مجھ پر مسلسل وار کرتا چلا گیا۔ میری کمر پر یہ نشانات انہی کچوکوں کے ہیں۔

دوپہر رات اس سے بچ کر نکلنے کے جتن میں گزر گئی۔ تاوقتیکہ ہم دونوں ایک گہری کھڈ کے کنارے جا پہنچے۔

میں نے ہمت کر کے شبکہ کو ایڑ لگائی تو وہ زقند بھرتے ہوئے پلک جھپکتے میں مجھے پار اتار لے گئی۔ جب کہ میرے پیچھے آنے والا سوار، وہیں ٹھہر گیا تھا۔

جب میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے دوسرے کنارے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ گہری کھڈ کے اس جانب میرا میزبان، ابی طاہر کھڑا تھا۔ میں سخت محجوب ہوا اور میں نے اپنی چادر سے چہرے کو ڈھانپ لینا چاہا تو اس نے باآواز بلند میرا نام لے کر کہا ---!

" ابو نواس، یہ جتن نہ کر۔ میں نے تجھے پہچان لیا۔ میں اس گھوڑی کا اصل مالک ہوں جو اس وقت تیرے نیچے ہے اور یہ اسی گھوڑی کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے، جس پر میں اس وقت سوار ہوں۔ یاد رکھ، میں تجھے بھاگ کر جانے نہیں دوں گا۔ اس کے باوجود کہ میں نے شبکہ کی پیٹھ پر بیٹھ کر جس کسی کو پکڑنا چاہا، اس سے جا ملا اور جس کسی نے بھی میرا پیچھا کیا، اس کے ہاتھ نہیں آیا۔ لیکن آج، خدا کی قسم تو مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ دیکھ میری شے مجھے لوٹا دے۔"

اس وقت تک سورج پوری طرح نکل آیا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان وہ گہری کھڈ حائل تھی اور اور وہ مشکی بچھیری پر سوار، ہات میں نیزہ تھامے میرے جواب کا منتظر۔

دوپہر رات کی اس دوڑ کے بعد میں نے اس بچھیری کے لمبے سانس کا اندازہ لگا لیا تھا اور ابی طاہر کے دم خم کا بھی۔ بے شک وہ سچا تھا اور اس بات کا مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اس نے مجھے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا۔

میں نے صورتِ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے بہت غور کیا، اور مکر کا ایک نیا جال بُنا۔ میں نے اسے مخاطب کر کے کہا ---:

" ابی طاہر، تو میرا محسن ہے لیکن یقین کر کہ تو اس گھوڑی کے قابل نہیں" ۔

اس نے استفسار کیا:

"کیسے؟"

میں نے کہا:

"گھوڑی اور عورت اس کی، جس کے نیچے۔ رہنے دے، ناگفتنی ہے۔"

اس نے بہت اصرار کیا تو میں نے کہا:

"رات کو برابر والے کمرے میں تیری بیوی تیرے پاس تھی لیکن میں تو جاگ رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تیرے غلام نے ادھر ایک کنکر اچھالا، اور جب تو گہری نیند سو گیا تو تیری بیوی تجھے وہیں سوتا چھوڑ کر، چھپر تلے حبشی کے پہلو میں آگئی۔ تو سو رہا تھا اور وہ دونوں غیر حالت میں تھے۔ تب میں نے تیرے گھر کے صحن سے اس گھوڑی کو کھولا۔"

میری یہ بات سن کر ابی طاہر کو چپ لگ گئی۔ اس نے گردن جھکا لی اور نیزہ زمین پر ٹیک دیا۔ تادیر خاموش رہا، پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا:

"نامراد، تو نے میرا سارا دم خم توڑ کر رکھ دیا۔ خدا کی قسم، آج تو بچ کر نہ جاتا، لیکن جو بات میں نے اب تیری زبان سے سنی، اس سے میں ڈھے گیا۔ آج سے تو میری گھوڑی پر قابض ہوا مجھ سے میری بیوی کو طلاق دلوائی اور غلام کو قتل کیا۔"

یہ کہہ کر ابی طاہر نے نیزہ سنبھالا اور اپنی بچھیری کی باگیں موڑ لیں۔ داستان گو کا بیان ہے کہ ابی طاہر نے ابونواس کی جاں بخشی کے بعد گھر پلٹ کر وہی کچھ کیا، جس کی اس نے ابونواس کو زبان دی تھی اور ابونواس نے وہی کیا جو کچھ کہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شبکہ کو مہر میں دے کر اپنی پسند کی لڑکی سے بیاہ رچایا۔ لیکن ابونواس، جو کچھ کہ کبھی تھا، ویسا نہ رہا۔ اس کے سارے کیے دھرے پر اس وقت پانی پھر گیا، جب شادی کے تیسرے روز اس کی محبوب بیوی خون تھوکتی ہوئی دم دے گئی۔ اور یوں، ابونواس نے اس نیلے آسمان تلے ہمیشہ خوف محسوس کیا۔

اک انجانا خوف، جس نے اسے مار کر رکھ دیا۔ اس نے حفاظت کی خاطر اپنے اردگرد ایک سنگی حصار کھڑا کیا اور دروازوں پر مسلح چوکیدار بٹھا دیے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے، جیسے کچھ تھا، جس نے اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ لیا۔

اس رات بھی آسمان پر چھدرے بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں اور

پورا چاند روشن تھا، جب ابو نواس کا سینہ رفتہ رفتہ بے صدا ہوتا چلا گیا۔

اس کے سنگی حصار کے روشن دان میں سے جھانکتا ہوا نیم روشن آسمان تھا اور نیچے گرد میں لپٹا ہوا سرمئی اندھیرا۔ ابو نواس ہر طرح محفوظ تھا لیکن ایک پھانس تھی جو اندر ہی اندر سے اٹھ کر اس کے نرخرے تک چلی آئی تھی اور اس کے لیے سانس لینا دشوار ہو گیا تھا۔

اس سے قبل بھی اکثر ایسا ہوا ہے، کہ جب ہر طرف چپ کی چادر تن جاتی اور وہ اپنے بستر پر اکیلا ہوتا تو یہ سانس کی پھانس ابھر آتی۔ لیکن آج اس کی مشکل سوا تھی۔ وہ اٹھ کر کھلے میں نکل جانا چاہتا تھا لیکن اس وقت اس کے لیے ایسا کچھ ممکن نہ تھا۔ اس کے گرداگرد کھنچے ہوئے حصار کے بھاری دروازے اندر سے مقفل تھے اور باہر چوکس چوکیدار، اور اسے اس مشکل کا سامنا تھا۔

اس کے سینے کی پھانس تھی یا ایک دہکتی ہوئی چنگاری، جو اس کے نرخرے تک اوپر اٹھ آئی تھی اور ابو نواس کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

وہ بد بخت آج پھر کیوں یاد آگیا۔ ابو نواس نے سوچا اور سر کو جھٹک دیا۔ پھر ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس نے اپنے گرد و پیش سے لاتعلق ہو جانے اور شانت رہنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

ایسے میں ابی طاہر، آگے اور آگے بڑھتا ہی چلا آتا تھا اور چوکیوں پر چوکس پہرہ داروں کو اس کی خبر نہ تھی۔

"او ۔۔۔ کوئی ہے؟ روکو اسے ۔۔۔۔"

ابو نواس نے اپنے سینے میں جمع شدہ سارے چنگھاڑتے جذبوں کو آواز دی لیکن وہ کسی کو اپنی مدد کے لیے بلانے سے قاصر ہی رہا۔

اس روز ابی طاہر کو کون روک سکتا تھا۔

ابی طاہر آیا اور اس کی پائنتی کی طرف کھڑے ہو کر اس سے مخاطب ہوا:

"میری طرف دیکھو ابو نواس! یہ میں ہوں، سیاہ زبان ۔ میری بد دعا سے بچنا تمھارے لیے ممکن نہ تھا۔"

پھر اس نے اسی طرح کھڑے کھڑے اپنی کالی زبان کو دونوں ہونٹوں پر پھیرا اور بولا:

" ابونواس، مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے۔ تم نے میری مشکی گھوڑی پر قبضہ کیا، میری وفا شعار بیوی کو طلاق دلوائی اور میرے جاں نثار حبشی غلام کے تم ہی قاتل ہو۔"

اس نے یہ کہا اور وہاں کچھ دیر رک کر پیتل جڑے دیو ہیکل بند دروازوں کی درزوں میں سے راستہ بناتا ہوا پلٹ گیا۔

صبح ہوئی تو ابونواس کے محافظوں کو تادیر سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوپہر دن تک وہاں کی ساری آبادی یکجا ہو چلی تھی۔ پھر رات گئے تک وہ سب پیتل جڑے دیو ہیکل دروازوں کو کاٹنے میں مصروف رہے، لیکن جب ابونواس تک پہنچنے میں کام یاب ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ ابونواس کی پیٹھ ننگی تھی اور اس کا وجود دوہرے پلنگ پر کمان کی صورت، بجلی مارے ہوئے لوہے کی طرح بھر بھرا ہو چلا تھا۔

داستان گو نے بیان ختم کرنے کے بعد دونوں ہونٹوں پر دھیرے دھیرے اپنی زبان کو پھیرا، اک ذرا تامل کیا، پھر بولا:

" ابی طاہر کے خشک حلق کو تر کرنے کی خاطر پانی نہیں لاؤ گے کیا؟"

اے ۔ خیام

افسانہ "کالی زبان" کا تجزیہ

داستانیں اردو ادب کا ایک اثاثہ ہیں اور اس کی اساس پر آج بھی افسانے لکھے جا رہے ہیں ۔ داستانوی طرزِ بیان کا اپنا ایک سحر ہے ۔ اس کے اپنے لوازمات ہیں ، ان سے استفادہ کے لیے اس کی روح میں اتر جانا ضروری ہے ۔ کسی خواہش کے حصول کے لیے داستانوں میں شجاعت ، ذہانت اور عقل مندی کی مثالیں تو ملتی ہیں لیکن ان کے منفی استعمال کی مثالیں نہیں ملتیں ۔ داستان کے سحر پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اس لیے ان سے اجتناب کیا جاتا ہے یا پھر منفی اثرات قایم کرنے کے لیے ایسے کرداروں کا انتخاب کیا جاتا ہے جو روایتاً مثبت نہیں ہوتے ۔ شجاعت اور ذہانت کا استعمال کسی خواہش کے حصول میں معاون و مددگار ہوتا ہے لیکن کائیاں پن ، جھوٹ اور فریب سے ایک مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس اساس پر بنا ہوا کردار قاری کی ہمدردیوں کا مستحق نہیں ٹھہرتا گو کہ وہ کردار خواہش کے حصول کی شرط پوری کر دیتا ہے لیکن قاری کو کوئی خوشی نہیں ہوتی ۔ داستانوی طرزِ بیان کا سحر قایم نہیں ہو پاتا بلکہ ایک چھٹکے پن کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔

اس وقت میرے زیرِ تجزیہ ایک افسانہ " کالی زبان " ہے ۔ عنوان اگر " کالی کی زبان " ہوتا تو پڑھنے سے پہلے ہی ذہن فراخ ہو جاتا ، خود بہ خود ذہن ہندو دیو مالائی کردار کو سمونے کے لیے ایک وسعت پیدا ہو جاتی لیکن ایسا نہیں ہے ۔ عنوان " کالی زبان " ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ کالی زبان والے شخص کے منھ سے کوئی بری یا غلط بات نکل جائے تو وہ ہو کر رہتی ہے ، لیکن افسانے میں ایسا بھی نہیں ہوتا ۔ عنوان افسانہ سے غیر متعلق ہے ۔ اس افسانے کا طرزِ بیان داستانوی ہے لیکن وہ سحر پیدا نہیں جس کی توقع تھی ۔ ابو نواس اپنے چچا کی بیٹی پر فریفتہ تھا ، اس کے حصول کی ایک شرط تھی کہ بنی بکر کی سب سے تیز رفتار مشکی گھوڑی " شبکہ " کو مہر میں دے ۔ ابو نواس اس شرط کو پورا کرنے کے لیے چل پڑا ۔ اسے مصائب یا مشکلوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا ، بس ایک طویل سفر کیا اور بنی بکر کی آبادی تک پہنچ گیا ۔ یہاں تک قاری کے لیے بڑی سپاٹ سی کیفیت ہے جب کہ خاصی گنجائش موجود تھی ۔ مشکی گھوڑی " شبکہ " کے مالک تک پہنچنے میں اسے کوئی تگ و دو نہیں کرنی پڑی ۔ ابی طاہر جیسے

اس کے لیے آنکھیں بچھائے بیٹھا تھا۔ اس کا استقبال کرتا ہے، سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے، مہمان بناتا ہے، کھانا کھلاتا ہے، قہوہ پلاتا ہے اور سفر کی روداد سننے کا متمنّی ہوتا ہے ــــــ سفر کی روداد ــــــ ؟ جی ہاں مسفر کی روداد، سفر کا مقصد نہیں، اصولاً میزبان کو سفر کا مقصد پوچھنا چاہیے تھا اور اپنی اعانت پیش کرنی چاہیے تھی لیکن یوں بھی نہیں ہوا۔ "شبکہ" کے حصول کے لیے ابو نواس بہت ساری دولت جمع نہیں کرتا، میزبان کو دولت کی پیشکش نہیں کرتا۔ اس کے حصول کے لیے وہ کسی بھی کڑی سے کڑی شرط پوری کرنے کا متمنّی نہیں ہوتا کوئی دادِ شجاعت نہیں دیتا اپنی ذہانت اور ذکاوت و عقل مندی کو بروئے کار نہیں لاتا، وہ چوری کی نیت سے گیا تھا اور چوری کرکے "شبکہ" کو لے بھاگتا ہے۔

"شبکہ" ایک گھوڑی کا نام ہے۔ گھوڑی ایک وفادار جانور ہے جس کی نسلیں اس گھر میں پلی بڑھی ہیں یعنی جس کی کوکھ سے "شبکہ" نے جنم لیا ہے وہ بھی اس گھر میں موجود ہے لیکن "شبکہ" ذرا بھی چوں و چرا نہیں کرتی، اپنے مالکوں اور اپنی ماں سے علاحدہ ہوتے ہوئے اور ایک اجنبی کے ساتھ جاتے ہوئے وہ ایک مرتبہ بھی نہیں ہنہناتی بلکہ چور کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتی ہے۔ "شبکہ" کا مالک ابی طاہر "شبکہ" کی ماں کی سواری کرتا ہوا اس کا تعاقب کرتا ہے اور نیزے سے ابو نواس کی پیٹھ پر "خراشیں" لگاتا ہے۔ ابو نواس تو ہے ہی کائیاں، ابی طاہر کو مغالطے میں ڈالتا ہے اور اس سے بیوی کو طلاق اور غلام کو قتل کرا دیتا ہے۔ خود "شبکہ" کے حصول کی شرط پوری کرکے اپنی چچا زاد سے شادی کر لیتا ہے لیکن شادی کے تیسرے روز ہی اس کی محبوب بیوی خون تھوکتی ہوئی دم دے دیتی ہے۔

"شبکہ" کا مالک ابی طاہر ایک مہمان نواز شخص ہے، مہمان کو کھانا کھلانے کے بعد وہ بچے بچائے کھانے پر اکتفا کرتا ہے۔ اس بچے بچائے کھانے میں تین برابر کے حصے کرتا ہے اور اپنی بیوی اور غلام کو برابر کا حصہ دار بناتا ہے۔ یہ دین دار شخص اپنی دین داری پر اعتمادی نہیں کرتا، غلام کی وفاداری پر اعتبار نہیں کرتا، اپنی زندگی کی رفیق بیوی بھی اس کے لیے مشکوک ہو جاتی ہے، اور یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ ایک چور کی بات اس کے لیے معتبر ٹھہرتی ہے۔ جس نے گفتگو کرنے سے بھی احتراز کیا ہے اسی کے گھر میں سیندھ لگایا ہے، اس کے قیمتی سرمایہ "شبکہ" کو لے اڑا ہے۔ اس کے بہکاوے میں آکر ابی طاہر اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے، غلام کو قتل کر دیتا ہے، اسے کسی شہادت کی ضرورت نہیں، کوئی

صفائی اور ثبوت درکار نہیں ۔

ابی طاہر کئی گھوڑیوں کا مالک ہے، غلام رکھنے کی استطاعت بھی ہے، "شبکہ" جیسی گھوڑی کا مالک ہے جس کی دور دراز شہرت ہے، ایسا شخص مفلس نہیں ہو سکتا جب کہ وہ مہمان کو کھانا کھلانے کے بعد بچے بچائے کھانے آپس میں تقسیم کر کے کھاتا ہے ۔ یہ شخص جس کو کھانا کھلاتا ہے، اپنا نمک کھلاتا ہے، اس نمک حرام کی بات پر صد فی صد یقین کر کے خود کو تباہ کر لیتا ہے ۔ اس آبادی کے تمام لوگ "شبکہ" کو پکڑنے کے لیے ابی طاہر کا ساتھ دیتے ہیں لیکن طلاق اور قتل سے کوئی اس کا بات نہیں روکتا ۔

"شبکہ" کے حصول کی شرط پوری کر کے ابونواس شادی کر لیتا ہے لیکن قاری کو ذرا بھی مسرت نہیں ہوتی ۔ اس کی محبوب بیوی شادی کے تیسرے ہی روز خون تھوکتی ہوئی مرجاتی ہے، قاری کو اس سے ہمدردی ہونے کی بجائے ابونواس کے لیے بڑھنے والی نفرت میں تھوڑا ٹھہراؤ آجاتا ہے ۔ لیکن بیوی کے مرجانے سے ابونواس کے ہمیشہ خوف میں مبتلا ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی ۔ ایک شاطر چور اس طرح کے صدموں سے دوچار ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جرائم سے توبہ کر سکتا ہے یا ضمیر کے کچوکے لگانے سے ساری زندگی بے چین و مضطرب ہو کر تو گزار سکتا ہے، اپنا طرزِ زندگی تو بدل سکتا ہے لیکن خوف زدہ ہونے کی کوئی منطقی دلیل نہیں بنتی ۔

داستانوی طرزِ بیان در اصل بے حد مشاقی اور احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے، کردار اور ماحول کے انتخاب سے علامتیں ابھرتی ہیں جو مطمعِ نظر کو واضح کرنے میں معاون ہوتی ہیں لیکن ان کو برتنا ایک مشکل امر ہوتا ہے اس کے لیے جاں سوزی اور مہارت درکار ہوتی ہے ۔ اس طرزِ بیان کو اختیار کرنے سے کوئی انتظار حسین یا مرزا حامد بیگ نہیں بن جاتا بلکہ بہ تدریج وہ اپنی صلاحیتیں ضایع کر رہا ہوتا ہے ۔ ویسے انتظار حسین بھی تو خود کو دہرا ہی رہے ہیں اور مرزا حامد بیگ بھی اپنی تخلیق "مغل سرائے" سے آگے نہیں بڑھ پائے ۔

ترتیب

اداریہ

پاکستانی ثقافت کا مسئلہ	راغب شکیب	۱۵
ہماری اجتماعی ذمہ داری	سیما شکیب	۱۷

نعتیں

حنیف اسعدی ۔ سجاد مرزا ۔ نظر ملک ۔ شہاب صفدر		۱۹

تفصیلی مطالعے

مرزا حامد بیگ ۔ ایک مطالعہ		۲۱
داخلی مونولاگ	مرزا حامد بیگ	۲۵
مٹی کا زنگ (افسانہ)	مرزا حامد بیگ	۳۰
افسانہ "مٹی کا زنگ" کا تجزیہ	مظہر جمیل	۳۷
سانڈنی سوار (افسانہ)	مرزا حامد بیگ	۴۲
صدر دروازے کا پھول	غلام حسین ساجد	۴۷
(سانڈنی سوار پر گفتگو)		
کالی زبان (افسانہ)	مرزا حامد بیگ	۵۲
افسانہ کالی زبان کا تجزیہ	اے ۔ خیام	۵۸
ڈاکٹر محمد امین ایک مطالعہ		۶۱
ڈاکٹر محمد امین	ڈاکٹر عرش صدیقی	۶۲
تعارف	ڈاکٹر محمد امین	۶۳
ہائیکو	ڈاکٹر محمد امین	۶۴
منظر کہانی (نثری نظم)	محمد امین	۶۵
مختصر شعری ہیئتیں	محمد امین	۶۶
غزلیں	محمد امین	۸۱

ادب اور زندگی کا اعلامیہ،
مشرقی و مغربی ادب کے فن پاروں کا ارتکاز
اور جدید تر ادبی رجحانات کا معتبر نمائندہ۔

QUATERLY **IRTEKAZ** KARACHI.

F-83/2, MARTIN QUARTERS, JAHANGEER ROAD KARACHI - 74800

جلد نمبر -۲- اکتوبر، ۱۹۹۵ء شمارہ ۱-۲

مُدیران: راغب شکیب
رسیما شکیب

زرِ سالانہ ہوائی ڈاک سے

پاکستان :- ۳۰۰ روپے برطانیہ :- ۳۰ پاؤنڈ اسٹرلنگ یا ۱۵۰۰ روپے

ہندوستان :- ۴۰۰ روپے سعودی عرب :- ۱۲۰ ریال سعودی یا ۱۰۰۰ روپے

امریکا :- ۴۵ امریکی ڈالر یا ۱۵۰۰ روپے متحدہ عرب امارات :- ۱۱۰ یو اے ای درہم کے

کنیڈا :- ۶۰ کنیڈین ڈالر یا ۱۴۰۰ روپے مساوی ۹۵۰ روپے

کویت :- ۱۰ کویتی دینار یا ۱۰۰۰ روپے کے مساوی

"ارتکاز" کے نام زرِ تعاون کی رقم صرف پاکستانی روپوں میں قبول ہوگی۔ اگر ڈالر، پونڈ ریال، دینار یا درہم وغیرہ کی صورت میں بھیجنا ناگزیر ہو تو رقم ڈالر، پاؤنڈ، ریال، دینار یا درہم وغیرہ اوپن بھیجیے اس رقم کو "ارتکاز" کے نام کراس نہ کیجیے۔ ڈرافٹ، چیک، منی آرڈر، پوسٹل آرڈر وغیرہ کی صورت میں ادارہ "ارتکاز" کو مقررہ زرِ سالانہ وصول ہونا چاہیے۔ Banking Process میں ہونے والی کٹوتی "ارتکاز" کے اکاؤنٹ میں قابلِ قبول نہ ہوگی۔

رابطہ کے لیے فون نمبر 656726

ایف - ۸۳/۲ مارٹن کوارٹرز، جہانگیر روڈ، کراچی

قیمت : ۱۰۰ روپے

ارتکاز
مدیران
راغب شکیب
سیما شکیب